

مقدّمہ

تاریخ زبانِ اُردو

اُردو کے عہد بعہد ارتقا کی تاریخ اور اس کی ابتدا سے متعلق لسانیاتی نظریوں کا جائزہ

بعد نظرِ ثانی و اضافہ

ڈاکٹر مسعود حسین خاں

ایم، اے پی، ایچ، ڈی (علیگ)، ڈی، لٹ (پیرس)

استاد شعبۂ اُردو، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

ناشر

آزاد کتاب گھر۔ دہلی

Political

Science

بار دوم بعد اضافہ و نظر ثانی

۱۹۵۴ء

قیمت

۴/۰/۰

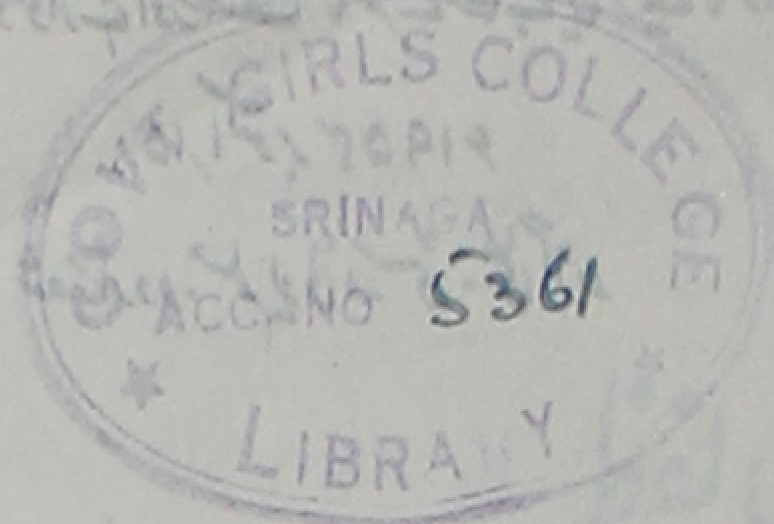
ناشر

آزاد کتاب گھر کلاں محل دہلی

ترتیب

تیسرا باب

چوتھا باب



طبع ثانی

"مقدمہ تاریخ زبانِ اُردو" کا دوسرا نقش باضافہ و ترمیم چھ سال کے بعد اُردو کے صاحبانِ علم کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۴۸ء میں اس وقت شائع ہوا تھا جب تاریخ کے صفحات پر خونِ آدم سے کتابت ہو رہی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں اس کی کتابت اور طباعت دونوں پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا سکی۔ اس کے باوجود اہلِ علم نے اس کی پذیرائی کی، حوصلہ افزا تبصرے کئے اور مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں اسے جگہ دی۔

موجودہ ایڈیشن کو نہ صرف کتابت کی غلطیوں سے پاک کیا گیا ہے بلکہ مختلف ابواب میں ضروری اضافے بھی کئے گئے ہیں۔ تاکہ اُردو کی ابتدا کے بارے میں جو نظریہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے اس پر مزید روشنی پڑ سکے۔ اور یہ زبان جو آج بھی اس دیس کی ایک زندہ حقیقت ہے اس کے تاریخی نقش کو اُجاگر کیا جا سکے۔

اس سلسلے میں میں اپنے دوست معزالدین احمد صاحب کا بدل ممنون ہوں کہ انہوں نے اس کتاب

کی دوبارہ اشاعت کا بیڑا اُٹھایا، بالخصوص ایسے زمانے میں جب کہ اُردو میں کسی علمی کتاب کا شائع ہونا دشوار ہے اور مصنف، ناشر کے مقابلے میں حریف ناتواں کی حیثیت رکھتا ہے۔

۱۵ر اکتوبر ۱۹۵۴ء
مسعود حسین
شعبۂ اُردو۔ مسلم یونی ورسٹی۔ علی گڑھ

پیش لفظ

جوں جوں اُردو زبان کا ڈول اور کینڈا متعین ہوتا گیا اس کی ابتدا اور ارتقاء کے متعلق سوالات بھی ذہن میں پیدا ہونے لگے۔ علم اللسان سے ناواقف لوگوں کے نزدیک یہ ایک کھچڑی زبان تھی جو عربی، فارسی، ترکی اور ہندی کے میل سے پیدا ہوئی تھی، جسے کبھی شاہجہانی لشکر سے منسوب کیا جاتا تھا اور کبھی اکبر کے سنہرے عہد سے۔ اُردو کی ابتدا کا یہ نظریہ بہت زیادہ تشفی بخش نہ تھا۔ ارتقا کا وہ تصور جس پر آج فکرِ انسانی کی بنیادیں قائم ہیں، لسانیاتی دنیا میں بھی کارفرما ہے۔ چنانچہ زبان جاننے والوں نے فوراً پہچان لیا کہ اس کھچڑی زبان کی تہہ میں کون سی بولی ہے۔ اس کا سہرا اُردو میں آزاد کے سر ہے جنہوں نے پہلی بار اُردو زبان کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی۔ مقدمۂ آبحیات اس لحاظ سے اب تک منفرد رسالہ ہے۔

ہند آریائی زبانوں پر نئی تحقیق کے باوجود اُردو زبان کی ابتدا کا مسئلہ ابھی تک دھندلکے میں ہے۔ زمانہ حال میں اس زبان کی ابتدا اور آغاز سے متعلق جو مختلف نظریے ملتے ہیں اُن میں سے بیشتر قیاس آرائیاں ہیں جن کا شاید ذکر بھی کسی علمی اور تحقیقی مقالہ میں

نہیں آنا چاہیئے۔ اُردو کو دکن، گجرات، مدراس اور سندھ سے جو نسبت ہے اُس کی تاریخی اہمیت مُسلّم ہے اور بس۔ مسائل زبان کو سمجھنے والے اُردو کی ابتدا کے سلسلے میں اُن نظریوں کا ذکر تک شاید گوارا نہ کریں۔

ہند آریائی لسانیات میں اس عہد کا سب سے بڑا کارنامہ گریرسن کا عظیم الشان "لسانیاتی جائزہ ہند" (۱۹۱۶) ہے۔ گریرسن نے سب سے پہلے بالتفصیل اِن قیاس آرائیوں کا ازالہ کیا ہے۔ جو ہماری زبان کے کینڈے کے متعلق بغیر سوچے سمجھے کی گئی تھیں۔ اس نے ہند آریائی زبان کے تاریخی تسلسل کی نشان دہی کی۔ اور جدید آریائی زبانوں کے باہمی رشتوں کو معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اُسی نے سب سے پہلے کھڑی بولی کو ایک مستقل بولی کی حیثیت بھی بخشی۔ لیکن گریرسن پنجابی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کے باہمی رشتوں کا ٹھیک ٹھیک پتہ نہ چلا سکا۔ اسی لئے کھڑی بولی کی علیحدہ حیثیت کو مانتے ہوئے بھی وہ متضاد باتیں لکھ گیا ہے۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ کھڑی بولی، برج اور پنجابی کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے۔

گریرسن کی لسانی تحقیقات اُردو زبان کے متعلق حرفِ آخر کا حکم نہیں رکھتیں۔ پروفیسر شیرانی جیسے بالغ نظر محقق نے یہ فوراً بھانپ لیا۔ شیرانی کو اپنے نقطۂ نظر کے لئے اشارہ خود گریرسن کی تحریروں میں مل گیا ہے جس نے اُردو کے "پنجابی پن" پر غیر معمولی زور دیا ہے۔ اِس دور کا اُردو میں لسانیاتی تحقیق کا سب سے بڑا کارنامہ پروفیسر شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" ۱۹۲۸ ہے۔ جو ترتیب کے اعتبار سے نامکمل سہی تحقیق کے اعتبار سے گرانقدر تصنیف ہے۔

لیکن اُردو کی ابتدا کے سلسلہ میں تحقیق کا دروازہ یہیں پر بند نہیں ہو جاتا۔ پروفیسر

شیرانی نے دہلی کی قدیم زبان کے متعلق محض قیاس آرائی سے کام لیا ہے اور ہریانی زبان کو اُردو کی قدیم شکل کہہ کر چھوڑ دیا ہے۔ حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ سلاطین دہلی کے لشکر میں اور شہر کے بازاروں میں ہریانہ علاقہ کی آبادی کا عنصر ہمیشہ زیادہ رہا ہے۔ لہٰذا اُردو کی ابتدا پر کام کرنے والوں کی توجہ نواح دہلی کی بولیوں پر مرکوز ہونی چاہیئے۔ ساتھ ساتھ ہمسایہ بولیوں پنجابی، برج بھاشا اور راجستھانی پر بھی نظر رکھنی پڑے گی۔

اس نئے لسانی میدان کی طرف اشارہ سب سے پہلے پروفیسر ٹرول بلوک کی تحریریں (بلیٹن آف اورنٹیل اسکول اسٹڈیز (لنڈن، ۱۹۲۸) میں ملتا ہے۔ بعد کو "ہندوستانی لسانیات" (۱۹۳۲) میں ڈاکٹر زور نے بھی اُردو پر ہریانی زبان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" ہو یا ٹرول بلوک کا ہریانی پر زور یہ تمام نظریات نیم صداقتوں کے حامل ہیں۔ شیرانی نے یہ فرض کر لیا کہ نواح دہلی کی تمام بولیاں مسلمانوں کی فتح دہلی (۱۱۹۳ء) کے بعد ارتقا پذیر ہوتی ہیں۔ اور "چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لیکر گئے ہوں گے!" ٹرول بلوک نے نواح دہلی کی دوسری بولیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف ہریانی کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ اس سلسلے میں دونوں نے دہلی کی اس حیثیت کو فراموش کر دیا کہ یہ شہر ہریانی، کھڑی اور میواتی (راجستھانی کی بولی) کے سنگم پر واقع ہے۔ جنوب میں تھوڑے فاصلے پر برج کا علاقہ بھی شروع ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دہلی میں عرصے تک زبان کا معیار اور ڈھول متعین نہیں ہو سکا۔ ابتدا میں اُردو پر جمنا کے پار کی ہریانی اور میواتی کے لسانی اثرات رہے جن کی تائید پنجابی سے بھی ہوتی رہی۔ بعد کو سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہ جہاں کے عہد تک آگرہ دارالسلطنت

رہا اس طرح برج بھاشا کی تائید سے کھڑی بولی کا محاورہ غالب آتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی معیاری اُردو جمنا کے اِس پار کی مغربی یو۔پی کی بولیوں سے قریب تر ہے۔

پروفیسر شیرانی کی تحقیقات سے ہریانی زبان کے بعض قدیم مصنفین کے ادبی کارنامے ہمارے سامنے آگئے ہیں۔ جن کی زبان کا تجزیہ اور پنجابی کے قدیم ترین نمونوں سے تقابلی مطالعہ اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیتا ہے کہ ہریانی زبان پرانی اُردو کی باقی ماندہ شکل نہیں بلکہ ایک علیحدہ اور مستقل زبان کی حیثیت سے عرصہ سے مضافات دہلی میں رائج تھی۔ چنانچہ ہم نے اس مقالہ میں قدیم دکنی (جس کی توجیہ پروفیسر شیرانی نے پنجابی سے کی ہے) کے اکثر کھوئے ہوئے لسانی سرشتوں کی کھوج نواحِ دہلی کی بولیوں، ہریانی، کھڑی اور میواتی سے پیش کر کے اُردو کی ابتدا کے متعلق ایک نئے نظریے کا خاکہ پیش کیا ہے۔ اس طرح یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے۔ کہ ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کے وقت ہریانی اور پنجابی میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار تھا۔ قدیم اُردو اور دکنی کا "پنجابی پن" اس کا "ہریانی پن" بھی ہے۔ البتہ شورسینی اپ بھرنش کی جانشین ہونے کی حیثیت سے پنجابی زبان کے مقابلہ میں ہریانی اور کھڑی بولی کو زیادہ قدیم ماننا پڑے گا۔

زیرِ نظر مقالہ میں اُردو زبان کے تسلسل کی نشان دہی ویدک زمانہ (۱۵۰۰ ق م) سے عالم گیر کے عہد ۱۷۰۷ء تک کی گئی ہے۔ یہ ضروری بھی تھا۔ کیونکہ ہماری زبان اسی زبان کا پیوند ہے جو سالہا سال کے عرصہ میں ہند کی سرزمین میں پروان چڑھی۔ اُردو میں اس پر سب سے پہلے آزاد نے قلم اٹھایا لیکن اس سلسلے میں سب سے کامیاب اور مرتب کوشش ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی "ہندوستانی لسانیات (۱۹۳۰) ہے

جو بہ سبب اختصار تشنہ ہے۔ زبان کا نقشِ ماضی عام طور سے اس کے مستقبل کے لئے نشانِ راہ کا کام دیتا ہے۔ ہماری زبان کے اکثر نئے رجحانات اور مسائل کا حل اس کی پچھلی سرگذشت میں مل جائے گا۔

شمالی ہند میں اُردو زبان کے ارتقا کی داستان عہدِ اپ بھرنش سے شروع کی گئی ہے۔ اور اس عہد کے ادب میں نئی بولیوں کے بیج جہاں کہیں بھی نظر آئے ہیں ان کا بہ نظرِ تنقید جائزہ لیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے عہد کے دریافت شدہ مواد سے حتی الامکان پرہیز کیا گیا ہے۔ اور اس سلسلے میں صرف نادر مواد کو استعمال کیا گیا ہے جس کے لئے مختلف قلمی نسخوں کو کھنگالنا پڑا۔

برج بھاشا، کھڑی بولی (ہندوستانی یا زبان دہلوی)، پنجابی اور ہریانی بولیوں کے تقابلی مطالعہ پر مقالہ کے بیشتر صفحات صرف کئے گئے ہیں۔ ایسا کرتے وقت ہر زبان کے قدیم و جدید مستند نمونوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔ مقالہ کا یہ حصہ خالص لسانیاتی ہے۔ اس میں نواحِ دہلی کی تمام بولیوں کے باریک اختلافات کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاریخِ زبان سے جو نتائج ہم نے اخذ کئے ہیں، اُنہیں مبسوط لسانی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے۔ ضمناً اُردو کی ابتدا کے متعلق آزاد اور شیرانی کے نظریوں کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوتے دکنی زبان کے عقدہ کا نیا حل بھی پیش کیا ہے۔

مسعود حسین

ستمبر ۱۹۴۵ء

پہلا باب

ہندوستان کی آریائی زبانوں کی مختصر تاریخ

آریوں کا وطن اور داخلۂ ہند

ہند یورپی خاندان کی زبانوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ماہرین لسانیات اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ یہ تمام زبانیں کسی ایک قدیم زبان سے نکلی ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ہمیں میکس مولر کا یہ مقولہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ زبانوں کے ہند یورپی خاندان کا وجود اِس بات کی دلیل نہیں بن سکتا کہ اس کے بولنے والے بھی ایک ہی نسل سے ہیں۔ یہ اصل زبان کیا تھی ؟ اِس کے بولنے والے کہاں بستے تھے ؟ اور وہ کس طرح یورپ و ایشیا کے وسیع براعظموں میں پھیلے ؟ آریوں کے متعلق یہ ایسے سوال ہیں جن پر محققین آج تک متفق نہ ہو سکے۔ علمی تحقیق میں اختلاف کی کس درجہ گنجائش ہے اس کا اندازہ اِن مختلف نظریوں کا مطالعہ کرنے کے بعد ہوتا ہے جو آریوں اور اُن کے اصل وطن کے متعلق پیش کئے جاتے ہیں۔ اُن کا سلسلہ ہندوستان (پنجاب و کشمیر) سے شروع ہو کر ہندوکش، تبت، کاکیشیا، وسطِ ایشیا، جنوبی روس، بحیرۂ بالٹک کا ساحل، اسکنڈی نیویا، آسٹریا، ہنگری، شمالی جرمنی، پولینڈ اور بالآخر سائیبیریا اور خطۂ منجمد شمالی (لوکمانیہ تلک) پر ختم ہوتا ہے۔ ان سب نظریوں کی تفصیل اور پھر اُن کی تردید موضوع بحث کو صرف خبط کرے گا۔ لہٰذا یہاں چند مستند نظریوں کی وضاحت پر قناعت کی جائے گی۔

آریوں کی قدیم کتابوں میں اُن کے اصل وطن اور آمد کے سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ قدیم زمانے میں لوگوں کا خیال تھا کہ آریہ تبت سے آئے تھے۔ ہندوؤں کے مذہبی عقیدہ کی رُو سے تبت کو انسان کا پہلا مسکن مانا جاتا ہے۔ اِس لئے آریوں کو بھی اسی علاقے سے منسوب کیا گیا۔ سنسکرت کے بعض عالموں کا خیال ہے کہ آریہ قبائل ہندوستان ہی کی پاک سرزمین سے اُٹھے اور بعد کو ایران و یورپ میں پھیل گئے۔ اِس نظریہ کو پنڈت ہری اودھ نے اپنی کتاب "ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس"[1] میں وضاحت سے بیان کیا ہے اور اپنی اِس رائے کی تائید میں سوامی دیانند، شری نرائن بھون راؤ پاؤگی اور کئی یورپی عالموں کی رائیں پیش کی ہیں لیکن اِن نظریوں میں قباحت یہ ہے کہ یہ تحقیق سے زیادہ عقیدہ کی پیداوار ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ بقول میور[2] سنسکرت کی جتنی قدیم کتابیں ہیں ان میں آریوں کے بدیسی ہونے کی طرف کہیں بھی اشارہ نہیں ملتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی کہیں کھول کر نہیں لکھی گئی کہ آریہ اسی سرزمین سے اُٹھے تھے۔ رِگ وید کے اندر یہاں کے دیسی قبائل اور آریوں کی لگاتار لڑائیوں کے بارے میں جو اشارے ملتے ہیں اُن سے تو صاف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ آریہ قبائل شمالی مغربی ہندوستان کے دروں سے لڑتے بھڑتے اور فتح کرتے ہوئے ہندوستان کے میدانوں میں داخل ہوتے ہیں۔ اِن محققین کا یہ طریق استدلال بھی نہایت بھُس بھُسا ہے کہ چونکہ ہندوستان قدیم تہذیب و تمدن کا گہوارہ ہے اس لئے ابتدائی زبان کی تلاش یہیں کرنا چاہیئے۔ ایسا کہتے وقت اُن کے ذہن سے وہ لسانی رشتے یکسر محو ہو جاتے ہیں جو ہمیں ایک طرف ایران اور دوسری طرف یورپ کی موجودہ زبانوں سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس نظریہ کے حامیوں

---

[1] صفحہ ۱۳ [2] سنسکرت ٹیکسٹ بک، جلد دوم ص ۲۲۳

میں اختلاف رائے بھی ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ آریہ پنجاب میں دریائے سرسوتی کے کنارے بستے تھے۔ کچھ لوگ قندھار اور تبت کو آریوں کی جنم بھومی بتاتے ہیں۔ پروفیسر کیتھ کا، جس کی دبی زبان سے گریرسن بھی تائید کرتا ہے، خیال ہے کہ آریہ قبائل کا مرز و بوم ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر تھا۔ کیتھ کی یہ رائے ماں لینے سے وسطی ایشیا والے نظریئے (جس کی وضاحت آگے کی جائے گی) پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ گریرسن[1] کا خیال ہے کہ رگ وید کے سب سے پہلے منتر آریوں کے داخلہ ہندوستان سے قبل لکھے جا چکے تھے۔ یہ اس زبان میں لکھے گئے جو ہند ایرانی زبانوں کی ماں تھی۔

تقریباً سب جدید محققین لسانیات اس پر متفق ہیں کہ آریوں کے وطن کی تلاش وسطی ایشیا کے علاقوں ہی میں کرنا پڑے گی۔ ڈاکٹر چیٹرجی[2] کا خیال ہے کہ قرون اولیٰ کی ہندیورپی زبان و تمدن کا گہوارہ یوریشیا کے وہ وسیع میدان ہیں جن کا سلسلہ ایک طرف پولینڈ اور جرمنی سے ملتا ہے اور دوسری طرف یورالی پہاڑوں کے جنوب میں وسطِ ایشیا کے التائی اور تھین شان کے سلسلہ ہائے کوہ سے۔ پروفیسر شریدر نے تعین مقام کرتے ہوئے دریائے والگا کے دہانے کو آریوں کا اصل وطن قرار دیا ہے۔ ان کے خیال میں تاریخی دھندلکے میں آریہ مغرب اور جنوب مشرق کی طرف پھیلنا شروع ہوتے ہیں۔ جو گروہ مغربی یورپ میں داخل ہوتا ہے وہ

---

[1] لسانیاتی تبصرۂ ہند: جلد اوّل: حصہ اوّل ص۱۲۵

[2] بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا (انگریزی): سونیتی کمار چیٹرجی

مختلف شاخوں میں تقسیم ہو کر تمام یورپ میں پھیل جاتا ہے۔ اور موجودہ آرمینین، یونانی، البینین، اٹلیین، کیلٹک، جرمن، سلوانک اور تخارین زبانوں کو جنم دیتا ہے۔ دوسرا گروہ جو جنوب مشرق کی سمت اختیار کرتا ہے۔ بحیرۂ کیسپین کے شمال سے ہوتا ہوا موجودہ بدخشاں اور کوہ کند کے علاقہ میں پہونچتا ہے۔ جہاں وہ پھر دو شاخوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک شاخ مشرقی ایران میں داخل ہوتی ہے۔ اور پھر دریائے کابل کی وادی کے راستے سے ہندوستان میں۔

"کیمبرج ہسٹری آف انڈیا" میں پروفیسر (GILES) نے جغرافیائی اور تاریخی وجود کی بنا پر آریوں کی نقل وحرکت کے اس نظریہ کو رد کیا ہے۔ وہ آریوں کے پھیلنے کا مرکز آسٹریا ہنگری بتاتے ہیں۔ اور اس طرح ان کے خیال میں سب سے زیادہ فطری راستہ درّہ دانیال اور ایشیائے کوچک میں سے ہو گا۔ تاریخ میں بعد کو نقل مکان کی جتنی مثالیں ملتی ہیں ان میں یہی راستہ اختیار کیا گیا ہے بحیرۂ کیسپین کے شمال مشرق سے آریوں کا گذرنا اس لئے ناممکن قرار دیا گیا ہے کہ یہ نشیبی علاقہ ہے جس کا بیشتر حصہ عہد عتیق میں تہ آب تھا اس وقت بحیرۂ کیسپین اتنے وسیع رقبہ میں پھیلا ہوا تھا کہ اس کا سلسلہ جھیل اراں سے ملتا تھا۔ اسی طرح جنوبی روس سے کاکیشیا کی جانب بھی نقل وحرکت ناممکن تھی۔ پہاڑوں کے اس دشوار گذار سلسلہ کو یونانی قدرتی فصیل سمجھتے تھے۔ آج بھی یہ سلسلہ صرف درّہ دانیال سے عبور کیا جا سکتا ہے۔

لیکن "وسطی ایشیا" والے نظریہ کی تائید ان ریکارڈوں سے ہوتی ہے جو ۱۹۰۶ء میں ایشیائے کوچک میں دریافت ہوئے ہیں اور جن کا تعلق ۱۵۰۰ ق۔م سے ہے۔ ان ریکارڈوں میں بعض دیوی دیوتاؤں کے نام مثلاً "اندرا اردنا

میترا" وغیرہ ملتے ہیں جنھیں متنی کے حکمراں پوجتے تھے ۔ یہ نام سنسکرت کی مقدس کتابوں میں جوں کے توں پائے جاتے ہیں۔ بالخصوص اعداد تو سنسکرت اعداد سے اتنے ملتے جُلتے ہیں کہ یہ امر مسلم ہو جاتا ہے کہ آریہ کا کیشیا کے راستے سے ایشیائے کوچک اور مشرق کی طرف بڑھے ہوں گے اس طرح اوستا کی فطری اور غیر مصنوعی زبان کے دونوں کناروں پر ہمیں خالص مصنوعی زبان کے نمونے ملتے ہیں مشرق میں سنسکرت اور مغرب میں ایشیائے کوچک کے نئے دریافت شدہ ریکارڈوں کی زبان ۔ یہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ آریہ اِن دونوں مقاموں پر بیگانوں کی طرح رہے۔ اور اپنی نسل اور زبان کو الگ تھلگ رکھا جیسا کہ اُن کا عام دستور تھا۔ اس کے برعکس ایران خاص میں ان کی زبان فطری طور پر بدل کر اس مصنوعی رجحان کو گنوا دیتی ہے ۔

اِن آریوں کو تاریخی روشنی میں سب سے پہلے ہم شمالی مغربی ایران میں (۲۰۰۰ ق۔م) میں دیکھتے ہیں ہندوستان میں آریوں کے داخلہ کی تاریخ ۱۵۰۰ ق۔م مقرر کی جا سکتی ہے۔ یہ امر یقینی ہے کہ یہ ہندیورپی زبان بولنے والے آریہ اپنے داخلہ ہندوستان سے قبل عرصے تک مشرقی ایران میں قیام کرتے ہیں۔ جہاں اُن کی زبان ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی ۲۰۰۰ ق۔م تک "ہند ایرانی" منزل پر پہنچ جاتی ہے "ہندیورپی" زبان کی یہ "ہند ایرانی" شکل ہی ان تمام زبانوں کی ماں کہی جا سکتی ہے جو بعد کو ایران میں پھیلیں اور جسے آریہ بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ ہندوستان کے زرخیز میدانوں میں آریوں کا داخلہ کسی منظم سیاسی تحریک کی شکل میں نہیں تھا یہ عمل کئی صدیوں تک جاری رہا اور اس میں جہاں گیری سے زیادہ

جہاں پیمائی کا جذبہ کارفرما تھا۔

ہندوستان میں آریوں کا سابقہ دراویدی اور آسٹرک قوموں سے پڑا[1]۔ دراویدیوں سے اُن کا مقابلہ مغربی اور شمال مغربی ہندوستان میں ہوا۔ آسٹرک زیادہ تر مشرقی اور وسطِ ہند کے علاقوں میں آباد تھے۔ ان قوموں کو زیر کرنے میں اُنہیں کافی جدّوجہد کرنی پڑی۔ اِس جدّوجہد کی جھلک رگ وید کے بعض قصّوں میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ موجودہ ہندی تمدّن خالص آریائی تمدّن نہیں کہا جا سکتا۔ فاتح اور مفتوح دونوں آخر میں ایک دوسرے پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہی شکل یہاں بھی پیدا ہوئی جس طرح بعض مورخوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ ہندوستان میں آریائی تمدّن مذہب کی آڑ میں پھیلا لیکن آریا اقوام کے افراد بہت کم تعداد میں ہندوستان کو اپنا گھر بنا سکے۔ اِسی طرح یہ کہنا بھی تاریخی غلطی ہوگا۔ کہ آریائی سماج دراویدی تمدّن کو نگل گیا تھا۔ نئے انکشافات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہندوستان میں نووارد آریوں کو ایک ایسے تمدّن سے سابقہ پڑا تھا جو کئی لحاظ سے اِن صحرا نوردوں کے تمدّن پر فوقیت رکھتا تھا چنانچہ

---

[1] ہندوستان کے سب سے قدیم باشندے نیگریٹو قبائل تھے۔ اِن کے بعد ہند چینی سے آسٹرک قبائل آئے جنہیں بعد کو مغرب سے آئے دراویدی قبائل نے زیر کیا۔ ان کے بعد مغرب سے آریہ اور مشرق اور شمال سے تبت چینی قبائل کا خروج ہوا۔ ہندی تہذیب میں نیگریٹو قبائل کے اثرات ہنوز تحقیق طلب ہیں۔ البتہ آسٹرک اور دراویدی قبائل نے ہماری مرکب تہذیب کے بعض بنیادی عناصر فراہم کیے ہیں۔ تبت چینی اثرات صرف شمال مشرقی ہندوستان تک محدود ہیں۔

موجودہ ہندی تمدن کے بیشتر بنیادی عناصر اسی قدیم ہندوستانی تمدن کے یادگار ہیں۔ آریوں نے دراویدی مذہب کے بہت سے عناصر قبول کیے بعض دیوی دیوتاؤں کے تصورات اور دیو مالا، کچھ کھانے پینے کی چیزیں (پان سپاری) اور لباس (دھوتی اور ساری) خالص دراویدی عناصر ہیں۔ جہاں تک زبان کا تعلق ہے محققین نے دراویدی زبانوں کے بعض عناصر کی نشان دہی کی ہے[1] لیکن اِن زبانوں کا آریائی زبان کی قواعد اور صوتیات پر کافی اثر پڑا۔ اور آریائی زبان نے "ہند ایرانی" منزل سے گزر کر "ہند آریائی" شکل اختیار کر لی۔ شمالی ہند میں اب دراویدی زبانوں کا نام و نشان نہیں ملتا ہے۔ تحقیق کا یہ حصہ بالکل تاریکی میں ہے اور اس کے بجز کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ قدیم ہراکرتوں کی پیدائش دیسی انہیں بولیوں کی گود میں ہوئی ہوگی۔

لیکن قدیم غیر آریائی تہذیب کی سب سے بڑی دین "براہمی" رسم الخط ہے! جس کا ارتقا ہندوستان میں ہوا اور جو آج ہندوستان کی تمام زبانوں کی لکھاوٹوں (الا اُردو) کا ماخذ ہے۔ اور جسے آریوں نے شروع سے اپنی زبانوں کے لئے استعمال کیا ہے۔

---

[1] اس کے برعکس پنڈت شیش گری شاستری نے اپنی ایک کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تمام دراویدی زبانوں کا ماخذ سنسکرت زبان ہے۔

ہند آریائی زبان کا عہدِ قدیم

(۱۵۰۰ ق.م تا ۵۰۰ ق.م)

آریائی زبان کا پہلا مستند نقش ہمیں رگ وید (۱۰۰۰ ق.م سے قبل) کی شکل میں ملتا ہے۔ اس وقت "ہند یورپی" زبان "ہند ایرانی" منزل سے گذر کر خالص "ہند آریائی" شکل اختیار کر چکی تھی چنانچہ مشرقی ایران سے لے کر پنجاب تک اس لسانی ارتقاء کے تسلسل کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ رگ وید کے مختلف حصوں کی تصنیف مختلف زمانوں اور مختلف مقاموں پر ہوئی ہے۔ کسی میں قندھار کے راجہ دیوداس کا ذکر ہے تو کسی میں سندھ کے کنارے بسنے والے راجہ سُوداس کا۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے کچھ 'منتر' قندھار میں لکھے گئے، کچھ دریائے سندھ کے کنارے' اور کچھ جمنا کی وادی میں' رگ وید کے ابتدائی حصے تو تقریباً ڈھائی ہزار برس قبلِ مسیح کی تصنیف ہیں لیکن آخری باب آٹھویں صدی قبل مسیح میں، تصنیف ہوئے۔ آریائی تہذیب کے اس وقت دو بڑے مرکز تھے۔ مغرب میں گندھارا اور مشرق میں براہمہ ورتا (پٹیالہ۔ انبالہ اور کرنال کے اضلاع[1])۔ اس میں شک نہیں کہ

---

[1] چٹرجی: بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا صفحہ ۲۹ جلد اول۔

آریہ ابھی دریائے سندھ تک ہی پہونچ جائے تھے کہ ان کی زبان نے ادبی شکل اختیار کر لی تھی. لیکن رگ وید کے بیشتر 'منتر' اسی غیر مصنوعی اور سادہ زبان میں ہیں۔ جو اس وقت آریوں کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ اگر بقول میکڈانلڈ[1] رگ وید کی زبان کو ادبی مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہرگز نہ ہوگا کہ وہ اُس زمانہ کی بولیوں کی نشان دہی نہیں کرتی۔ ادبی زبان چالو زبان سے مختلف ضرور ہوتی ہے لیکن بالکل مختلف نہیں. ویدک زبان کا سلسلہ دوسرے ویدوں سے بالخصوص 'یجر وید' اور 'براہمنہ' کے نثری ٹکڑوں تک ملتا ہے. رگ وید کی ادبی زبان شمال مغربی ہندوستان کی آریہ بولی پر مبنی تھی آریوں کے مختلف قبائل کی بولیوں میں خفیف اختلافات تھے۔ لیکن رگ وید کی زبان کا معیار سب تسلیم کرتے تھے۔

مغربی ہندوستان کی اس آریہ بولی کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں (ر) اور (ل) دونوں آوازوں کے لئے صرف "ر" کی آواز مستعمل تھی، یہ خصوصیت قدیم فارسی میں بھی پائی جاتی ہے. اسمیں دھ، بھ۔ اور گھ قسم کی آوازوں کو "ہ" میں تبدیل کر دینے کا رجحان بھی ملتا ہے[2]۔ بعد کو چل کر یہی "ر" اور "ل" کی آوازیں مشرقی اور مغربی ہندوستان کی قدیم وجدید بولیوں میں امتیاز کرنے کی مخصوص علامتیں بن جاتی ہیں. مثلاً مغربی ہندوستان کی پراکرت میں "ل" کی آواز نہیں ملتی[3]۔ پالی اور سنسکرت میں مذکورہ بالا دونوں آوازیں پائی جاتی ہیں، لیکن جوں جوں ہم مشرق (بہار و بنگال) کی طرف جاتے ہیں، وہاں کی پراکرتوں میں صرف "ل" کی آواز ملتی ہے۔

---

[1] تاریخ ادب سنسکرت صفحہ ۲۰۔ [2] مبادیات پراکرت۔ اے بی وولنر صفحہ ۱۳

[3] مبادیات پراکرت. وولنر صفحہ ۱۶

"ر" بالکل غائب ہو جاتی ہے۔

دریائے سندھ سے آریہ جوں جوں مشرق کی طرف بڑھے اُن کی زبان پر صوبجاتی اور دیسی بولیوں (کول۔ دراویدی وغیرہ) کا بھی اثر پڑا۔ جدید کے مختلف بابوں کے مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ اثر صرف تلفظ تک محدود نہیں، بلکہ دیسی الفاظ کی آمیزش بھی ہونے لگی تھی۔ دراویدی اور کول زبانوں کے ایسے الفاظ کی ڈاکٹر چیٹرجی نے ایک طویل فہرست دی ہے[1] یہاں مثالاً صرف چند درج کیے جاتے ہیں۔ کپیی (بندر) کلا (آرٹ) کالا (وقت) کنڈا (کنڈ) نیلا (نیلا) پشپا (پھول) پوجا نا (پوجا) پھلا (پھل) بلا (بل) بیجا (بیج) میُورا (مور) راتری (رات) روپا (روپ)۔ براہمنہ میں جاکر ایسے الفاظ بہ کثرت ملتے ہیں، رفتہ رفتہ ملک کے دور دراز حصوں میں پھیلنے اور غیر آریہ اقوام سے ربط و ضبط بڑھنے کی وجہ سے آریہ زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہونے لگی۔ صرفی و نحوی اور صوتی اختلافات پیدا ہونے لگے۔ ایک ہی لفظ کی مختلف شکلیں بولی جانے لگیں، بعض جگہ الفاظ کو اجنبی ماحول کی صوتیات سے متاثر ہو کر توڑ مروڑ دیا جاتا۔ حروف کا تلفظ بھی مختلف طریقہ سے کیا جانے لگا مشرقی ہندوستان کے صوبوں میں یہ تبدیلیاں تیزی سے نمایاں ہونے لگیں، ۱۰۰۰ ق۔م تا ۷۰۰ ق۔م آریہ شمالی ہند میں، پنجاب سے لے کر بنگال تک پھیل چکے تھے۔ اور ان کی زبان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ اس عہد کی گروہ بندی حسب ذیل طریقہ پر کی جاسکتی ہے۔

(۱) اُودیچیہ ؛ شمال مغربی ہندوستان کی زبان۔

---

[1] چیٹرجی : بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا : جلد اوّل صفحہ ۴۲

(۲) مدھ دیشیہ : (مدھ دیش انبالہ سے الہ آباد) کی زبان۔

(۳) پراچیہ : مشرقی ہندوستان کی زبان۔

یہ آریہ سلطنتوں کے عروج کا زمانہ تھا۔ اودیچہ (شمالی مغربی ہندوستان کی زبان) کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل تھی کہ وہ آریوں کی قدیم معیاری زبان سے قریب تر تھی۔ ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں یہی زبان زیادہ صحیح اور کھری سمجھی جاتی تھی۔ اور لوگ آریوں کی معیاری زبان کی سند اس علاقے سے لیتے تھے۔ پراچیہ زبان کا رواج آریوں کے ان قبائل میں تھا جو موجودہ اودھ، مشرقی یوپی۔ اور مغربی بہار کے بعض حصوں میں آباد ہو گئے تھے۔ یہاں کی زبان دیسی بولیوں سے مل کر اپنا آریائی لہجہ کسی حد تک کھو چکی تھیں۔ مغربی ہندوستان کے آریہ ان کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور "اسوروں" (بھوت پریت) کی نسل سے تعبیر کرتے تھے۔ ان کی زبان کو "براہمنہ" میں 'اشدھ' کہا گیا ہے۔ اس میں (ر) کی آواز (ل) میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ (موجودہ بہاری : راجہ = لاجا۔ کھیر = کھیل)

مدھ دیش کی زبان کے تفصیلی حالات نہیں ملتے۔ یہاں کی زبان نہ تو اس قدر معیاری سمجھی جاتی تھی جتنی کہ شمال مغربی ہندوستان کی زبان اور نہ اس قدر ذلیل اور پست جیسی کہ پراچیہ (پورب) کی بولی۔ رفتہ رفتہ جوں جوں آریائی تہذیب، کا مرکز پنجاب سے ہٹ کر دوآبہ گنگ و جمن ہوتا گیا مدھ دیش کی زبان کو ممتاز حیثیت دی جانے لگی۔

اسی زمانے میں زبان کو نئے سرے سے منظم کرنے کی کوشش کی گئی صوبائی اور مقامی تعصبات سے الگ ہٹ کر صرف ایسے الفاظ کو ٹکسالی مانا گیا جو سب جگہ رائج ہو۔ اس طرح زبان صوبائی ہونے کی بجائے "راشٹری" (ملکی) بن گئی۔ سب لوگ

ادب میں ایک خاص قسم کی ٹکسالی زبان کا استعمال کرنے لگے۔ اور یہ زبان بن سنور کر سنسکرت (شدھ) ہو گئی۔ جو درجہ آج کل ہندوستانی کو حاصل ہے یا جو عہد پراکرت میں، مہاراشٹری کو حاصل ہوا وہی درجہ اس زمانے میں، سنسکرت کو حاصل تھا۔[1] ملک کے جن جن حصوں میں آریہ پھیل گئے تھے وہاں کے مذہبی علمی اور ادبی طبقوں یہ بھی اور بولی جاتی تھی۔ جو لوگ (بالخصوص پورب کے جہاں، پراکرت سب سے پہلے سر اُٹھاتی ہے) بول نہ سکتے تھے۔ وہ بھی سمجھ ضرور لیتے تھے۔ ہندوستانی بولیوں کی کثرت میں یہ وحدت کا کام دیتی تھی۔ ہندوستان کے قدیم ناٹکوں میں جن کا تعلق پہلے سنہ عیسوی سے ہے سنسکرت بولنے والے کرداروں کا تعلق عام طور سے براہمنوں یا اعلیٰ طبقے کے لوگوں سے ہے۔ اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ سنسکرت کا رواج خاص خاص طبقوں میں کافی عرصہ بعد تک رہا۔ اس لئے یہ عام خیال لسانیات کی رُو سے بالکل غلط ہے کہ سنسکرت کبھی بھی بول چال کی زبان نہیں رہی ہے۔ وہ تو صرف برہمنوں کی گھڑی "دیگوں" میں بولی جانے والی زبان تھی۔ پانِنی[2] نے (۳۰۰ ق۔م) میں زندہ زبان کی قواعد لکھی تھی۔ قواعد داں کبھی بھی کسی نئی زبان کی تخلیق نہیں کرسکتے۔ البتہ وہ کڑے اصول بنا کر اس کی ترقی کو روک سکتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ہیں اُس

---

[1] ہندی بھاشا اور ساہتیہ: شیام سندر داس: صفحہ ۷

[2] پانِنی: لاہور میں پیدا ہوا اور ٹکسلا میں تعلیم پائی یہ مقامات آریائی تمدن کے گہوارے تھے۔ جہاں کی زبان پوربی کے برعکس ویدوں کے زبان سے زیادہ قریب تھی۔ پانِنی کی قواعد مسلّمہ طور پر مدھیہ دیش اور پورب کے علاقوں میں معیاری کتاب کی حیثیت سے رائج تھی۔

زمانہ کے ان ماہر لسانیات کی کوششوں میں ملتی ہے۔ جنہوں نے ایک بین الاقوامی زبان "ایس پیرنیٹو" بنانے کے لئے برسوں سر مغزنی کی اور بالآخر متفقہ طور پر اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا۔ اس لئے تاریخ زبان میں اس قسم کے مفروضات کا بے معنی ہونا مسلم ہے۔ البتہ تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ گریرسن جیسے بڑے محقق نے سنسکرت کے متعلق اسی قسم کا اظہار خیال کیا ہے[۱]۔ ادبچے اور ادبی طبقے میں بول چال کی زبان ہونے کا وافر ثبوت ہمیں سنسکرت کے قدیم قواعد نویس یاسکا[۲] (مصنف نروکتا) کے یہاں ملتا ہے۔ جو اس زبان کو "بھاشا" (بولی جانے والی زبان) کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور اس میں اور ویدوں کی زبان میں امتیاز کرتا ہے۔ اس کے بعد پاننی (۳۰۰ ق۔م) نے بھی اس زبان کو بھاشا کہا ہے۔ وہ بھی ویدک سنسکرت کو مردہ اور ادبی سنسکرت کو زندہ زبان جانتا ہے۔ کات یاین اور پتن جلی جو پاننی کے بعد آتے ہیں، اس فرق کو برقرار رکھتے ہیں۔ ادبی سنسکرت بقول گریرسن کلاسیکل سنسکرت کی سب سے پہلی جھلک ہمیں آخری براہمنوں، اپنشدوں اور سوتروں میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں دراصل لفظ سنسکرت صفت کے طور استعمال ہوتا تھا "سنسکرت واکم" ٹھیک اس زبان کو کہتے تھے جسے اردو میں شستہ زبان کہا جاتا ہے[۳]۔ رفتہ رفتہ لفظ سنسکرت ایک خاص زبان کے سلسلے میں بولا جانے لگا۔ شستہ اور وسیع ہونے کی وجہ سے ادبی تصنیفات اسی میں ہونے لگیں، سنسکرت زبان کی اس وقت کی شکل کو استحکام بخشنے کی خاطر پاننی نے

---

[۱] لسانیاتی جائزہ ہند جلد اول۔ حصہ اول۔

[۲] تقابلی لسانیات کی مبادیات: پی۔ ڈی۔ گنے صفحہ ۲۶

[۳] ہندی بھاشا اور ساہتیہ، شیام سندر داس: صفحہ

اس کے کڑے اصول بنائے ہیں لیکن پانِنی اور دوسرے قواعد نویسوں کی پابندیوں کے باوجود سنسکرت زبان میں، کیا باعتبارِ الفاظ اور کیا باعتبارِ صرف و نحو کافی عرصہ تک ارتقا ہوتا رہا ہے اور بحیثیت علمی و تصنیفی زبان کے اس کا رواج جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے بہت بعد تک رہا۔

رفتہ رفتہ سنسکرت کا رواج کم ہونے لگا۔ اس کے کئی سبب تھے چونکہ اُس نے مذہب اور ادب کو اپنے آغوش میں جگہ دی، اس لئے یہ عوام کی بولیوں سے دور ہوتی گئی۔ نیز ہندوستان جیسے وسیع ملک میں ہر زبان کا مقدر یہ ہے کہ وہ تھوڑے عرصہ میں خواص کی زبان بن جائے۔ لیکن اس کے زوال کا سب سے بڑا سبب وہ مذہبی انقلاب تھا جو مہاویر سوامی اور مہاتما گوتم بدھ کی کوششوں سے ہندوستان میں نمودار ہوا۔ دونوں نے اپنے اپنے دھرموں کا پرچار اپنے یہاں کی مقامی بولیوں میں کیا عوام نے اس کا استقبال کیا۔ اس طرح مذہب کا سہارا لے کر صوبائی بولیاں جگہ جگہ اُٹھیں، اور سنسکرت سے ٹکر لینے لگیں، رد عمل کے طور پر ویدک مذہب کے علمبردار اپنی زبان کی حفاظت اور زیادہ سختی سے کرنے لگے۔ سنسکرت رفتہ رفتہ ایک فرقہ کی زبان بن کر رہ گئی۔ سنسکرت کے زوال کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ ویدوں کی زبان تھوڑی بہت منظم ہونے کے باوجود اتنی ٹھس اور جامد نہیں تھی جتنی کہ ادبی سنسکرت، اپنی اہلیت کی وجہ سے اُس نے "دیوبانی" اور "امربانی" کا رتبہ تو پایا لیکن یہی "امرپن" اسکے لئے بار بن گیا۔ ادھر اس کی دوسری بہن جو رانی نہ بن کر عوام کی گود میں پلی، جس نے آریوں کے علاوہ غیر آریوں کو بھی سمیٹا مروجہ زبان کی ماں بن بیٹھی۔ استعارہ میں یہی بات یوں کہی جائے گی کہ زبان کا جو دھارا آریوں کے وقت سے بہنا شروع ہوتا ہے اُس کی ایک شاخ جھیل کی شکل

اختیار کر لیتی ہے۔ حسین لیکن محدود، جسے ہم سنسکرت کہتے ہیں جس کے اِرد گرد اس کی گرامر کے سنگین ساحل پھیلے ہوئے ہیں۔ اس دھارے کی دوسری شاخ مختلف روپ بدلتی ہوئی اب تک بہ رہی ہے۔ کبھی گدلی، کبھی تابناک لیکن ہر لحظہ پھیلتی ہوئی۔ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کا تعلق بہ راہِ راست دھارے کی اسی شاخ سے ہے۔ مختصر یہ کہ آریوں کی ابتدائی زبان ہی سے ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت پیدا ہوئیں۔ اور غیر آریوں کے میل کا سہارا پاکر دوسری صوبائی بولیاں بھی پھوٹیں۔ سنسکرت نے صرف چنے ہوئے شائستہ اور بلیغ الفاظ سے اپنا خزانہ بھرا لیکن دوسری نے ویدک زبان کے فطری رجحان کو اپنایا۔ یہی ان کے 'پراکرت' (فطری) کہلانے کا سبب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ویدک زبان کی بعض خصوصیتیں، جو ان میں ملتی ہیں، ادبی یا کلاسیکل سنسکرت میں نہیں ملتیں۔ اس طرح ویدک سنسکرت اور پراکرتوں میں ادبی سنسکرت کی بہ نسبت زیادہ قریب کا رشتہ دکھائی دیتا ہے۔[۱]

مذکورہ بالا سطور میں یہ بات واضح ہوگئی کہ شروع ہی سے عوام کی زبان ایک مخلوط زبان تھی۔ ایک ایسی زبان تھی جس میں آریوں کی ابتدائی زبان اور دیسی بولیوں دونوں کا میل تھا۔ بعض لوگوں نے اسی کو "پہلی پراکرت" کہا ہے۔ اور ویدک سنسکرت اور ادبی سنسکرت دونوں کی ماں مانا ہے۔ ہم اُسے "ابتدائی زبان" کے نام سے یاد کریں گے۔ اور پہلی پراکرت صرف اسی زبان کو کہیں گے جس کا ادبی روپ پا گئی ہے۔ ویدک سنسکرت اسی "ابتدائی زبان" کا سہارا لے کر کھڑی ہوئی۔ اور اس کا پرچار کافی عرصہ تک برہمنوں

---

[۱] مشر بندھو ونود: پہلا حصہ صلا چوتھا ایڈیشن۔

کے گھروں، اور ان کی مذہبی کتابوں میں، رہا۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب یہ ترش ترشا کر برہمنوں کے ہاتھوں سنسکرت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ادبی سنسکرت کی پیدائش کے بعد بھی عوام کی بولی کا دھرا الگ رہا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمیں سنسکرت کے قدیم نمونے مل جاتے ہیں۔ اور عوام کی ان بولیوں کے نام تک نہیں ملتے۔ پراکرت کے سب سے قدیم نمونے بدھ اور جینیوں کی مذہبی کتابوں یا پھر اشوک (۲۵۰ ق۔م) کی لاٹوں پر کندہ کئے ہوئے ملتے ہیں۔ اسی کو پہلی پراکرت ماننے پر مجبور ہیں۔ پراکرت کی اسی ادبی شکل کو پالی کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ لیکن پراکرت کا یہ نام اس وقت پڑا جب اس نے ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اور اس پر شورسینی پراکرت (شورسین: متھرا اور اس کے ارد گرد کا علاقہ) کا پورا پورا اثر پڑ چکا تھا۔ لفظ پالی سنسکرت کے "پنکتی" سے نکلا ہے۔ (اسی سے اردو کا پانتی۔ پتی اور پٹی) پنڈت ہری اودھ کی تحقیق کے مطابق پالی بدھ دھرم شاستر کی سطر کو کہتے ہیں۔ اسکے نام سے ثابت ہے کہ بدھ مت کی ابتدائی کتابیں اسی زبان میں لکھی گئی ہوں گی۔[1] اسی پالی کو قدیم ماگدھی بھی کہتے تھے۔ لیکن یہ ماگدھی (مگدھ = جنوبی بہار) بعد کی نئی ماگدھی سے مختلف تھی۔ اس وقت یہی بول چال کی زبان تھی۔ بدھ لوگ اسی کو سب سے پہلی زبان مانتے ہیں۔ اور بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ انسانوں کی سب سے قدیم زبان یہی ہے۔ اور اس سے دیگر زبانیں سنسکرت وغیرہ نکلی ہیں۔ گوتم بدھ نے اسی بولی میں اپنے دھرم کی تبلیغ کی تھی۔ مدھ دیش کے عالموں اور ادیچیہ (پنجاب وغیرہ) کے بولنے والوں کے نزدیک یہ ایک لچر اور پوچ زبان تھی جس میں ان کی زبان کے الفاظ بگاڑ دیئے جاتے تھے۔ گوتم بدھ اس زبان کی اہمیت پر کس قدر زور دی

---

[1] ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس: پنڈت ایودھیا سنگھ، ہری اودھ ص ۲۲

دیتے تھے اس پر روشنی اس واقعہ سے پڑتی ہے جو ان سے منسوب ہے۔ یمیلو اور اُمے کیل ناموں کے دو برہمن بھائی مہاتما کے پاس آتے ہیں، اور درخواست کرتے ہیں کہ اے بھگون! مختلف ذات پات کے لوگ آپ کے بولوں کو دھرا کر ناپاک کر رہے ہیں۔ اس لئے ہمیں حکم دیجئے کہ انہیں چھندوں (ویدک سنسکرت) میں لکھدیں تاکہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جا سکے۔ مہاتما انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں، اے بھکشوؤ!! بدھ کے بولوں کو سنسکرت میں ہرگز لکھنا۔ جو ایسا کرے گا وہ میری توہین کرے گا۔ میری باتوں کو اپنی ہی بھاشا میں سمجھنے کی کوشش کرو۔[1] "اپنی بھاشا" سے مراد یہی ماگدھی زبان ہے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے پہلی پراکرت یا پالی کے نمونے یا تو بدھوں کی مذہبی کتابوں میں ملتے ہیں، یا پھر اشوک کی لاٹوں پر جو جنوب میں گنجم سے لے کر یوسف زئی کے علاقہ میں، شہباز گڑھی تک ملتی ہیں۔ یہ تحریریں کھروشٹری اور براہمی دو رسم الخطوں میں ملتی ہیں۔ شہباز گڑھی اور مان سہرا کی تحریریں تو کھروشٹری میں ہیں اور باقی سب براہمی میں۔ ان کی موشگافی کے بعد محققین اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اشوک کے زمانہ میں، زیادہ سے زیادہ چار اور کم سے کم دو زبانیں رائج تھیں۔ ایک مشرقی اور دوسری مغربی۔ مغربی زبان پر جیسا کہ شہباز گڑھی کی لاٹ سے ثابت ہے سنسکرت کا اثر گہرا تھا۔[2] وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے مشرقی زبانوں کی بہ نسبت قدیم آریائی

---

[1] ہندی بھاشا اور ساہتیہ: شیام سندر داس: ص ۱۳

[2] تقابلی لسانیات کی مبادیات: پی۔ ڈی۔ گُنے ص ۱۹۳

زبان سے زیادہ قریب تھی۔ گریرسن نے بھی زبان کے اس اختلاف کو مشرقی اور مغربی پراکرت کے نام سے یاد کیا ہے۔ دونوں کی اپنی اپنی لسانیاتی خصوصیات ہیں، جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتی ہے۔ مغربی پراکرت کی نمایاں شکل شورسینی پراکرت تھی۔ مشرقی پراکرت ماگدھی کہلاتی تھی۔ یہ مگدھ دیس (جنوبی بہار) میں بولی جاتی تھی۔ اس زمانہ تک کسی ایسی پراکرت کا پتہ نہیں ملتا جسے دکھنی پراکرت کہا جا سکے۔

آریائی زبان کا عہدِ وسطیٰ

(۵۰۰ ق.م تا ۶۰۰ سنۂ)

اِس عہد میں بھی ہند آریائی زبان کے ارتقا کی دو نمایاں شکلیں نظر آتی ہیں ، ایک طرف تو عوام کی بولیاں بدھ اور جین متوں کا سہارا لے کر تیزی کے ساتھ ادبی پراکرتوں کی شکلیں اختیار کر رہی تھیں ، دوسری طرف سنسکرت جو باعتبار صوتیات اور صوریات ابھی تک قدیم آریائی زبانوں سے رشتہ جوڑے ہوئے تھی ، اور جس کی نحو اور فرہنگ سے روحِ عصر بھی جھلکتی تھی علمی اور ادبی طبقوں میں اپنی دھاک جما رہی تھی ۔ بدھ اور جین متوں کے پیغمبر بھی سرزمین ہند سے اس کی جڑیں نہ اکھاڑ سکے ۔ بلکہ جوں جوں پراکرتوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا اور زبان کا دھارا اپنے سرچشمہ سے دور ہوتا گیا سنسکرت کی اہمیت کا لوگوں کو اور زیادہ اندازہ ہوتا گیا ۔ اگر ایک طرف یہ عہدِ وسطیٰ کی لسانی خصوصیات کی آئینہ بردار تھی ۔ تو دوسری طرف قدامت پرستی کے جذبہ کو بھی تسکین دیتی تھی ۔

ویدک سنسکرت کے بہت سے لفظ اب متروک ہو گئے۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے پانینی کے سخت قیود و بند کے باوجود سنسکرت کا ارتقا نہ رک سکا۔ قطع نظر فرہنگ کے نحوی قواعد میں بھی خفیف تبدیلیاں ہوتی رہیں۔

سنسکرت کے پہلو بہ پہلو پراکرتوں کا بھی ارتقا ہوتا رہا۔ موجودہ تحقیقات کی بنا پر پہلی اور دوسری پراکرت میں خطِ فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ دوسری پراکرت کے ابتدائی حالات کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ پالی ہی کے اندر ہمیں اس پراکرت کی شکل دکھائی دیتی ہے۔ پچھلے باب میں بتایا جا چکا ہے کہ تلفظ کا بگاڑ اور الفاظ کا توڑ مروڑ سب سے پہلے

۱؎ چٹرجی نے اپنی کتاب "انڈو ایرین اور ہندی" میں صفحہ ۶۳ پر ایسے الفاظ کی ایک طویل فہرست دی ہے۔ چند درج کیے جاتے ہیں:-

ویدک سنسکرت	سنسکرت	معنی	ویدک سنسکرت	سنسکرت	معنی
اَشوَ	گھوٹک	گھوڑا	ری سا	گِرہ	گھر
اَس مَن	پرستر	پتھر	دُرُ	ورکش	درخت، رُکھ
شوَن	کوکر	کتا	اُدَن	جَل	پانی
اَوِی	میش	میش (بھیڑ)	اَمرک	کرشنا لوہیتا	لوہ
اُوکشن	بالی ورد	بیل	ہَن	ماریا	مارنا
رائس	دھن	دولت	یاچ	پورچھ یہ	پوچھنا
واہس	بَل	بل	وِرج	کمپ	کانپنا

ہندوستان کی مشرقی بولیوں میں نمودار ہوتا ہے۔ ان بولیوں میں حروفِ صحیح کا میلان جذب پذیری کی طرف پایا جاتا تھا۔ اور دندانی آوازیں (مثلاً "ر" کا "ل" میں بدل جانا) نخی آوازوں میں بدل جاتی تھیں۔ یہ خصوصیات آج بھی بنگال اور بہار کی بولیوں میں پائی جاتی ہیں۔ مشرقی ہندوستان میں سنہ ق م کے لگ بھگ (مہاتما بدھ سے کچھ پہلے) دوسری پراکرت کا عہد شروع ہو جاتا ہے۔ مغربی یو۔پی (دوآبہ) اور پنجاب میں یہ لسانی تبدیلیاں آہستہ آہستہ بعد کو رونما ہوتی ہیں۔ آج بھی ان علاقوں کی بولیوں میں انفی آوازوں اور مشدّد لفظوں کی کثرت ملتی ہے۔ جو عہدِ وسطیٰ کی پراکرت کی نمایاں خصوصیتیں تھیں۔ اس کے برعکس مشرق کی بولیوں میں حروفِ علّت کا استعمال بکثرت پایا جاتا ہے۔

عہدِ وسطیٰ کی پراکرتوں میں جذب پذیری اور دندانی آوازوں کو نخی آوازوں میں تبدیل کر دینے کا مذکورہ بالا رجحان ضروری نہیں کہ دراویدی اور آسٹرک زبانوں کے اثرات کا نتیجہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ یہ نسل اور زبان کے ارتقا کا فطری عمل ہو۔ چونکہ ابھی تک دراویدی اور آسٹرک کے متعلق پورا علم نہیں ہے اس لیے تحقیق کا یہ پہلو ابھی تک تاریکی میں ہے۔

اس عہد کی ادبی پراکرت کی پانچ واضح شکلیں نظر آتی ہیں۔

(۱) مہاراشٹری: ادبی حیثیت سے اس زمانہ میں مہاراشٹری پراکرت کو سب سے زیادہ عروج حاصل تھا۔ عہدِ پراکرت کے قواعد نویسوں نے اس کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔ بلکہ اسے نمونہ مانا ہے۔ دوسری پراکرتوں کا سرسری طور پر ذکر کر دینے کے بعد ہمیشہ یہ لکھ دیا ہے کہ باقی سب باتوں میں یہ مہاراشٹری سے ملتی جلتی ہیں۔ اس

عہد کا بیشتر شعری ادب اسی پراکرت میں ملتا ہے۔ موسیقی میں بھی اس کا استعمال ہوتا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ حروفِ علت کی کثرت کی وجہ سے اس میں لوچ زیادہ تھا۔ آج بھی مہاراشٹر کا سنگیت اُتم مانا جاتا ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لفظِ مہاراشٹر سے اکثر ملک ہندوستان مُراد لی جانے لگی۔

ڈاکٹر چٹرجی نے ڈاکٹر من موہن گھوش کی ایک تصنیف کے حوالہ سے مہاراشٹری پراکرت کی علیحدہ حیثیت کو ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اُن کے خیال میں مہاراشٹری کی نسبت ملک مہاراشٹر سے نہیں بلکہ وہ شورسینی پراکرت کی ایک شستہ اور ترقی یافتہ شکل تھی۔ (مفصل بحث کے لئے دیکھئے چٹرجی کی انڈو ایرین اور ہندی صفحہ ۸۴)

(۲) شورسینی:۔ اس کا مرکز شورسین دیس (دوآبہ کا وسطی حصہ: متھرا) تھا۔ سنسکرت کے بعد اعلیٰ طبقہ میں اگر کسی پراکرت کا رواج تھا تو وہ یہی تھی جس پر سنسکرت کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں بھی اس کی جھٹ پٹ جھلک ملتی ہے۔ دراصل متھرا (دوآبہ گنگ جمن) ہی وہ علاقہ ہے جہاں سنسکرت اور شورسینی پراکرت دونوں پروان چڑھتی ہیں۔ اس لئے دونوں میں نہایت قریب کا رشتہ نظر آتا ہے۔ سلہ ء سے پہلے ہی اُس نے مسلم ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

(۳) ماگدھی:۔ مگدھ دیس (جنوبی بہار) کی پراکرت تھی۔ چونکہ یہ آریائی تمدن کے مراکز سے کافی دور جا پڑی تھی اس لئے ایک غیر مہذب اور ناشستہ زبان سمجھی جاتی تھی۔ ماگدھی پراکرت اس وقت آریائی زبان کے پھیلاؤ کی مشرق

یں آخری حد تھی۔ بعض مصنفوں نے اس پراکرت کو پالی سے خلط ملط کردیا ہے۔ حالانکہ یہ امر تحقیق شدہ ہے کہ پالی کا یہ نام (ماگدھی) سب سے پہلے سیلون کے بدھوں میں پڑا۔ جو ہندوستانی زبانوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔

(۴) شورسینی اور ماگدھی پراکرتوں کے درمیانی علاقے (بہار سے الہ آباد تک) میں اَردھ (آدھی) ماگدھی پراکرت بولی جاتی تھی۔ آج جس علاقے کو دتی والے پورب[1] کے نام سے پکارتے ہیں، مغربی ہندوستان کے رہنے والے اُس وقت 'پراچیہ' کہا کرتے تھے۔ 'پراچیہ' کے تحت ماگدھی اور اُردھ ماگدھی دونوں آجاتی تھیں۔ اِن دونوں میں اَردھ ماگدھی کو زیادہ فروغ رہا۔ گوتم بُدھ اور مہابیر جین دونوں نے اسی کی قدیم شکل میں اپنے اپنے دھرم کا پرچار کیا۔ اس کا رواج اُس زمانہ کے شاہی خاندانوں تک میں رہا۔ شاہی زبان ہونے کی وجہ سے یہ دوسری پراکرتوں پر اثر انداز بھی ہوئی۔ تاریخ سے اس بات کا وافر ثبوت ملتا ہے کہ دوآبہ کے رہنے والوں کو اس وقت مشرق کی اس پراکرت کے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی تھی۔ یہ اُس وقت کی معیاری زبان تھی۔ گرنار۔ شہباز گڑھی اور مان سہرا کی لاٹوں تک میں اس کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ لیکن خود اَردھ ماگدھی پراکرت مارکنڈے کے مطابق شورسینی اور ماگدھی کے میل سے بنی ہے۔ آج کل کی مشرقی ہندی (پوربی) کے بناوٹ پر غور کرنے سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف

---

[1] میر نے بھی کہا ہے ع کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!

یہ موجودہ بہاری اور دوسری طرف مغربی ہندی (دوآبہ کی زبان) کی آمیزش سے بنی ہوگی۔

(۵) لیکن ابھی پشاچی پراکرت (وہ پراکرت جو پنجاب اور کشمیر کے علاقے میں بولی جاتی تھی: پشاچ = کچا گوشت کھانے والے) کا مسئلہ باقی ہے۔ یہ اتنی دُھندلکے میں تھی کہ عوام میں یہ بھوت اور پریت کی زبان کے نام سے مشہور تھی۔ عہدِ پراکرت کے قدیم قواعد نویس وررچی[1] (تقریباً ۱۰۰ ق م) نے جو چار پراکرتیں گنائی ہیں، اس میں پشاچی کو بھی جگہ دی ہے۔ اس کی فہرست حسبِ ذیل ہے۔

(۱) مہاراشٹری (۲) پشاچی (۳) ماگدھی (۴) شورسینی۔ ہیم چندر نے بھی جس کا زمانہ بارھویں صدی کے اواخر کا ہے، اس پشاچی کا ذکر کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ اس میں ادب بھی ملتا ہے۔ راج شیکھر (دسویں صدی کے آغاز) نے اپنی "کاویہ میمانسا" میں ایک پرانا اشلوک نقل کیا ہے جس سے اس زمانہ کی بولیوں کے متعلق معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ اس کے خیال میں جو شاعر مدھ دیش (دوآبہ) میں رہتا ہے وہ لاٹ (گجرات) ٹکّ (ٹانک جنوبی پنجاب) بھادانک (راجپوتانہ کا کوئی حصہ؟) ان سب علاقوں کی زبانوں پر قدرت رکھتا ہے۔ گریرسن نے بھی رام شرما کی تحریروں کے اس حصے پر کافی زور دیا ہے جس میں پشاچی کا ذکر ہے۔ رام شرما سے اتفاق کرتے ہوئے گریرسن پشاچی زبان کی دو شکلیں قرار دیتا ہے۔ ایک خالص اور دوسری مخلوط۔ پہلی کی سات اور دوسری

---

[1] ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس: ہری اودھ: صفحہ ۴۷

کی چار شکلیں مانی گئی ہیں۔ کشنوں کے عہد (پہلے سنہ ء سے چار سنہ ء تک) میں شمال مغربی ہندوستان کی اس پراکرت کو فروغ حاصل ہوا۔ اس زمانہ میں شاہی سرپرستی کے تحت "گندھار" کی بولی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے اس علاقہ میں رائج ہو گئی۔ اور ٹکسلا کا دار العلوم اس وقت علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا، جہاں تحصیل علم کی خاطر ہندوستان کے دُور دراز علاقوں سے طالب علم آتے تھے۔

موجودہ پشاچی زبانیں خالص ہندوستانی نہیں کہی جا سکتیں۔ اُن کے تلفظ کے اصول (مثلاً الف کے بعد میں "ر" کا تلفظ) ہند آریائی زبانوں کے اصولوں سے مختلف ہیں۔ ان میں کہیں کہیں ایرانی زبانوں کی خصوصیات بھی جھلک آتی ہیں۔ وہ نہ تو خالص ہندوستانی معلوم ہوتی ہیں۔ اور نہ خالص ایرانی۔ ژند اوستا کی زبان سے شاید بہت پہلے ان کا تعلق ہند آریائی زبانوں سے منقطع ہو گیا تھا۔ بھنڈارکر کے خیال کے مطابق "یہ پشاچی پراکرت شاید آریہ قوم کی اُس شاخ سے تعلق رکھتی ہے جو ہم قوموں کے ساتھ عرصہ تک رہی لیکن ہندوستان میں اُن کے بعد داخل ہوئی۔ یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ دوسری آریہ قوموں کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں داخل ہوئی ہو لیکن علیحدہ ایک طرف پہاڑی علاقے میں بس گئی ہو" دونوں صورتوں میں پشاچی پراکرت آریائی زبان ہونے کے باوجود ہندوستان کی آریائی زبانوں سے کافی حد تک مختلف ہو جاتی ہے۔

یہ باب ختم کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ جیسا کہ اوپر بھی مذکور ہو چکا ہے ہر پراکرت کا نام اس دیس کے کسی نہ کسی علاقہ

سے منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ پراکرت اس علاقہ کی بولیوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ یہ درحقیقت ایک بہت بڑا لسانی مغالطہ تھا، جسے جدید تحقیق نے رد کر دیا ہے۔ مثلاً پالی جسے ماگدھی بھاشا کے نام سے بھی پکارا گیا ہے مگدھ دیس (جنوبی بہار) سے کوئی تعلق نہیں رکھتی تھی۔ یہ بہار کی قدیم بولی کی بہ نسبت مدھ دیش کی قدیم بولی سے زیادہ قریب دکھائی دیتی ہے۔ جس کے تانے بانے شورسینی پراکرت سے گتھے نظر آتے ہیں۔ یہی حال مہاراشٹری پراکرت کا تھا۔ جو بقول چیٹرجی[1] شورسینی پراکرت کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی۔

---

[1] انڈو ایرین اور ہندی : صفحہ ۸۴

آریائی زبانوں کا تیسرا دور

(۶۰۰ء تا ۱۰۰۰ء)

لسانیات کا یہ ایک اٹل اصول ہے کہ بول چال کی زبان جتنی تیزی سے بدلتی ہے ادب کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے سکتی۔ چنانچہ جب پراکرتوں نے ادبی شکل اختیار کرنا شروع کی تو وہ عوام کی ڈگر سے پرے جا پڑیں، اور عوام کی زبان کا دھارا آگے بڑھتا رہا۔ اسی بول چال کی زبانوں کو اس عہد کے قواعد نویسوں نے "اپ بھرنش" (بگڑی زبان) کہا ہے۔ تاریخ لسانیات کی یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ لوگ ہمیشہ زبان کے سنورنے کو اس کے بگڑنے سے تعبیر کرتے چلے آئے ہیں۔ "بھامہ" اور "دنڈی" (ساتویں صدی عیسوی) کے تذکروں اور ولبھی کے راجہ دھرسین کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں اپ بھرنش تحریریں استعمال ہونے لگی تھی۔ کالی داس کی "وکرم اُروشی" میں اس کے اشعار ملتے ہیں[1]۔ بلکہ بعضوں کے نزدیک

---

[1] سامان بھاشا دگیان صفحہ ۱۸۹ : بابورام سکسینہ

تو دوسری یا تیسری صدی عیسوی سے ہی اس کی جھلکیاں پراکرت کے ادب میں ملتی ہیں۔
(مثلاً اُس زمانہ کی شمال مغربی پراکرت کا عام رجحان یہ ہے کہ (و)، (و) میں تبدیل
ہوجاتا ہے) لیکن اَپ بھرنش کو اتنا قدیم نہیں مانا جاسکتا۔ کیونکہ پراکرتوں کے نمونوں
میں اَپ بھرنش کی عام خصوصیات مثلاً سنسکرت (: اح) اور (م) کی بجائے
(اُ) یا (م) کی بجائے (واں) وغیرہ نہیں ملتیں۔ غرضیکہ اس کے بیج ممکن ہے
دوسری صدی عیسوی کی پراکرت تک میں مل جائیں۔ لیکن یہ پروان چھٹی صدی عیسوی
میں جاکر چڑھتی ہے۔ ڈاکٹر سدھیشور ورما بھی اس سے متفق ہیں۔ "اَپ بھرنش (لفظی معنی
"افتاد") پراکرت کا مابعد ارتقا ہیں۔ ان بولیوں کا آغاز چھٹی صدی عیسوی سے ہوا[1]
ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے طلوع کی تاریخ ۱۰۰۰ء مقرر کی گئی ہے لیکن
اَپ بھرنش میں تصنیفات کا سلسلہ چھٹی سے لیکر چودھویں بلکہ پندرھویں صدی عیسوی
تک ملتا ہے۔ "پراکرت پنگل" (پندرھویں صدی عیسوی) کی تصنیف اس بات کا کھلا
ہوا ثبوت ہے کہ اَپ بھرنش (بلکہ پراکرت تک) کی قدیم روایات کے جکڑ بند
سے عرصہ تک ہمارے شعر و ادب کو چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ اس زمانہ میں علمیت کا
سارا دار و مدار اس بات پر تھا کہ ان روایات کو کس حد تک نبھایا جاتا ہے۔ حقیقت
یہ ہے کہ اگر مسلمانوں کی فتوحات نے اس وقت ہر چیز کو تہ و بالا نہ کر دیا ہوتا تو
شمالی ہند میں نئی آریائی زبانوں کا ظہور عرصہ تک کے لئے ملتوی ہو جاتا۔

شروع شروع میں لفظ "اَپ بھرنش" کسی خاص زبان کے لئے استعمال

---

[1] آریائی زبانیں، صفحہ ۵۶

نہ ہوتا تھا۔ پڑھے لکھے لوگ ان پڑھوں کی زبان کو "اپ بھرنش" یا "اپ بھاشا" کہا کرتے تھے۔ پتن جلی نے اپنی "مہا بھاشیہ" میں اس لفظ کا ذکر ان معنوں میں کیا ہے۔ اس کے خیال میں اس زبان میں بگڑے ہوئے الفاظ کی تعداد خالص سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ سنسکرت کے ایک ایک لفظ کے کئی کئی اپ بھرنش ملتے ہیں۔ یہاں اپ بھرنش سے مراد پتن جلی وہ الفاظ لیتا ہے جو سنسکرت کے کسی ایک لفظ کے معنوں میں مختلف مقامات پر بولے جاتے تھے۔ آریہ لوگ اپنی زبان کے معاملے میں بڑے کٹر واقع ہوئے تھے۔ سنسکرت میں "ملچھ" اپ بھرنش لفظ کے لئے بھی استعمال ہوا ہے۔ گھن اور نفرت کا مفہوم بعد کو پیدا ہوا۔ ایک خاص زبان کے مفہوم میں سب سے پہلے ہیم چندر نے لفظ اپ بھرنش استعمال کیا ہے۔

اپ بھرنش کو ملک کی زندہ زبان پاکر بالآخر تعلیم یافتہ طبقہ بھی اس کی طرف متوجہ ہوا۔ پورب کی زبانوں تک نے اس کے اثر کو قبول کیا۔ لیکن گجرات 'راجپوتانہ' اور دوآبہ میں بولی جانے والی بولیوں پر اس کی چھاپ گہری پڑی۔ چنانچہ ۸۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک دوآبہ کی شورسینی اپ بھرنش ایک طرح سے سارے شمالی ہندوستان کی ادبی زبان بن گئی تھی۔ اس کا سب سے بڑا سبب راجپوتوں کا سیاسی اقتدار تھا۔ جن کی راج دھانی اس وقت گنگا کی ترائی میں شہر قنوج تھا۔ اس کے علاوہ گجرات کے جینیوں نے بھی اس کو ترقی دی۔ پراکرت کے بڑے عالم مارکنڈے نے اپ بھرنش کی تین قسمیں بتائی ہیں۔

(۱) ناگر اپ بھرنش:۔ جو گجراتی اور راجستھانی کی قدیم بولیوں کی ادبی شکل تھی۔ لیکن جس پر شورسینی کا اس قدر اثر پڑا تھا کہ وہ اس کی بیٹی معلوم ہوتی تھی۔ اس

اپ بھرنش کو فوقیت اس لئے حاصل تھی کہ یہ علمی طبقہ میں مقبول تھی۔ اس میں تصانیف کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ ہندی رسم الخط کا نام "ناگری" اسی کی رعایت سے پڑا ہے۔ خود اس کا "ناگر" نام گجرات کے ناگر برہمنوں کے نام پر پڑا۔

(۲) براچڈ اپ بھرنش :- یہ سندھ میں رائج تھی۔ موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔

(۳) اُپ ناگر :- یہ ناگر اور براچڈ کے میل سے بنی تھی۔ اور اس کا رواج مغربی راجپوتانہ اور جنوبی پنجاب میں تھا۔

(۴) پورب میں اشوک کے بعد وہاں کی زبان نے بالکل ترقی نہیں کی۔ کم از کم ماگدھی پر تو تاریخی سایہ آ ہی جاتا ہے۔

یہ ایک نیچ زبان سمجھی جانے لگی تھی۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں نیچ ذات کے کرداروں سے یہی بلوائی جاتی تھی۔ اردھ ماگدھی اور ماگدھی دونوں کے علاقوں میں شورسینی ہی ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ اس زمانہ میں پورب کے شاعر اسی میں شاعری کرتے تھے۔ اور یہ سلسلہ دِنوں تک قائم رہا۔ دسویں سے تیرھویں صدی تک کی پرانی بنگلہ شاعری میں شورسینی کا اثر صاف جھلکتا ہے۔[1] میتھلا (بہار) کے مشہور شاعر ودیاپتی (تیرھویں صدی عیسوی) نے میتھلی کے ساتھ ساتھ "اوہٹ" میں بھی شاعری کی ہے۔ اس طرح شورسینی اپ بھرنش اس وقت شمالی ہند کی "لنگوا فرینکا" کی حیثیت رکھتی تھی۔ جو گجرات و مغربی پنجاب سے لے کر بنگال

---

[1] بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا: صفحہ ۴۸ : چٹرجی

تک رائج تھی۔ اس کے ادب کی نشان وہی سنہ ۸۰۰ء سے سنہ ۱۳۰۰ء تک کی جا سکتی ہے[1]۔ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، گجرات اور راجپوتانے کے جینیوں نے اس میں

---

[1] (۱) بکرم ۹۹۰ میں دیوسین نام کے ایک جینی مصنف گذرے ہیں، جن کے دوہوں کی دو کتابیں ملتی ہیں۔ اپ بھرنش کی بیشتر شاعری دوہوں میں ہے۔

(۲) ہیم چندر (بکرم ۱۲ صدی) نے بھی جو پراکرت اور اپ بھرنش کے بڑے قواعد نویس تھے اپنی قواعد میں اپ بھرنش کے دوہے نقل کئے ہیں۔

(۳) بکرم تیرھویں صدی (۱۲۸۱) میں سوم پربھا سوری ایک جینی عالم نے "کمار پرتی بود" نام کی ایک کتاب تصنیف کی تھی اس میں بھی اپ بھرنش کے دوہے ملتے ہیں۔

(۴) بکرم ۱۴ ویں صدی (۱۳۶۱) میں جینی عالم "میرو تنگ" نے "پربندھ چنتامنی" نام کی ایک تصنیف میں جگہ جگہ اپ بھرنش کے دوہے نقل کئے ہیں۔ ان میں بعض دوہے خود مصنف کے ہیں۔

(۵) بکرم پندرھویں صدی میں ودیاپتی (بہار کا مشہور شاعر) نے دو کتابیں لکھیں "کرتی لتا" اور "کرتی پتاکا" لیکن ودیاپتی کی اپ بھرنش میں مروجہ زبان کی پٹ بھی آجاتی ہے۔ اُس نے ایک دوہے میں اپ بھرنش اور "دیسی بھاشا" کے فرق کو اس طرح بتایا ہے "دیسی بھاشا سب کو میٹھی لگتی ہے اس لئے اس سے ملی ہوئی اپ بھرنش میں شاعری کرتا ہوں"۔ اس میں سنسکرت کے "تت سم" (خالص) الفاظ بھی ملتے ہیں، جو پراکرت کے لسانی اصول کے خلاف ہیں۔ اس عہد کا جو ادب جدید زبانوں میں ملتا ہے اس پر بھی اپ بھرنش کا گہرا اثر دکھائی دیتا ہے۔

(ہندی ساہتہ کا اتہاس صفحہ ۲ تا ۱۷: مہابیر پرشاد دویدی)

ادب کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ بنگال میں بدھ مت کے مبلغوں (سدھوں) نے مذہبی امور کے لئے اسی کو اپنایا۔ پنجاب میں "گورکھ پنتھیوں" نے اپنے پراسرار مذہب کی تبلیغ کے لئے اسی کو آلۂ کار بنایا۔ مذہب اور ادبیات سے قطع نظر دوآبہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں یہ گھریلو زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ جس میں عوام کی مذہبی اور عشقیہ واردات کے زبردست نقش ملتے ہیں۔ ڈاکٹر کیتھ کا یہ خیال صحیح نہیں کہ اپ بھرنش آبھیر (موجودہ اہیر) اور گوجر قوموں کی زبان[1] تھی۔ جیسا کہ پرانی بنگلہ کی شاعری اور ودیاپتی کی تصنیفات سے صاف ظاہر ہے۔

رفتہ رفتہ یہ اپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر رہ گئی۔ اپنے آخری دور (۱۰۰۰ء) میں یہ بہت کچھ موجودہ زبانوں کی قدیم شکلوں سے ملتی جلتی ہے۔ موجودہ ہندوستانی زبان اور شورسینی اپ بھرنش کی درمیانی منزل کو بعض اوقات "اوہٹ" بھی کہا گیا ہے۔ ودیاپتی کی شاعری اسی میں ہے۔ اس میں عام طور سے مروجہ بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اسی "اوہٹ" میں جب پراکرتی روایات کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ تو اسے پنگل کہتے ہیں۔ راجپوتانہ کے بھاٹ شاعر اپنی ڈنگل (قدیم راجستھانی) کے ساتھ ساتھ اس میں بھی شاعری کرتے تھے۔ یہ صحیح صحیح بتانا ذرا مشکل ہے کہ اپ بھرنش کس سنہ میں ختم ہوتی ہے اور موجودہ آریائی زبانوں کا کب آغاز ہوتا ہے۔ لسانی تبدیلیاں نہایت چپکے اور چھپ کے رونما ہوتی ہیں۔ اندازاً کہا جا سکتا ہے کہ جدید زبانوں کا طلوع ۱۰۰۰ء سے ہوتا ہے یہ بہت بڑے سیاسی الٹ پھیر کا زمانہ تھا۔

---

[1] تاریخ ادب سنسکرت : مقدمہ

مسلمان آناً فاناً شمالی ہند کو زیر کرتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ۔ ان کے جلو میں ایک نیا تمدن اور ایک نئی زبان آ رہی تھی ۔ اُنھوں نے سنسکرت کے فسوں کو توڑ کر بہت جلد ہندوستان کی نئی زبانوں کو اپنے بل پر کھڑا ہونا سکھایا ۔ ہندوؤں کی ازمنۂ وسطیٰ کی مذہبی تحریکوں سے اُن کو تقویت پہونچی ۔ چنانچہ بہت جلد ان زبانوں میں مذہبی گیتوں اور کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ۔

اس عہد میں سنسکرت کا دخل فصل بھی کم ہو گیا تھا ۔ لیکن مذہبی حلقوں میں اب بھی اس کا راج تھا ۔ البیرونی (۱۰۲۵ء) نے اپنے ہندوستان کے دورانِ قیام میں اس بات کا اندازہ کر لیا تھا کہ عوام کی زبان اور ان کا شعر و ادب سنسکرت کی سخت بندشوں سے آزاد ہو کر آگے بہہ رہا ہے ۔ لیکن اسے عوام کی ان بولیوں سے نہ تو دلچسپی تھی اور نہ واقفیت ۔ قدیم علوم کی تحصیل کی وجہ سے اس کا تعلق زیادہ تر سنسکرت جاننے والے پنڈتوں سے رہا ۔ اسی وجہ سے اس نے سنسکرت کی اہمیت پر غیر معمولی زور دیا ہے[1] ۔

غرضکہ ہندوستان کی جدید زبانوں کی پیدائش پراکرتوں سے نہیں بلکہ اپ بھرنشوں سے ہوتی ہے ۔ اُن کا سلسلہ حسب ذیل اپ بھرنشوں سے ملایا جا سکتا ہے ۔

(۱) شورسینی اپ بھرنش :-

(۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی (موجودہ اردو ہندی)

---

[1] اورنیٹل کالج میگزین ۔ مئی ۱۹۴۳ء : عربی تصانیف میں ہندوستانی کے الفاظ : ڈاکٹر عبداللہ ۔

(۲) راجستھانی ۔

(۳) پنجابی (مشرقی)

(۴) گجراتی اور پہاڑی بولیاں ۔

گجراتی اور راجستھانی کا تعلق شورسینی کی اس شکل سے ہے جسے ناگر اپ بھرنش بھی کہا جاتا ہے ۔

(۲) ماگدھی اپ بھرنش :- اس کا علاقہ بہت وسیع تھا۔ اس لئے مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام پڑ گئے ۔ بنگال میں پراچیہ، گوڑ اور ڈھکی کہلائی جس سے موجودہ بنگالی اور آسامی نکلیں ۔ اڑیسہ میں اس کا نام "ات کلی" پڑا جس سے موجودہ زبان اُڑیا نے جنم لیا ۔ بہار کی تمام بولیاں اس کے تحت آجاتی ہیں ۔ بہار کی ایک بولی کا نام "مگہی" ہے جو ماگدھی لفظ کی بگڑی ہوئی شکل ہے ۔

(۳) اردھ (آدھی) ماگدھی اپ بھرنش :- پوربی ہندی (اودھی وغیرہ)

(۴) مہاراشٹری اپ بھرنش :- اس کا خاص مرکز موجودہ برار تھا ۔ سنسکرت کے ادب میں اسی صوبہ کو مہاراشٹر کے نام سے پکارا گیا ہے ۔

(۵) شمال مغربی ہندوستان کی پراکرتیں اور اپ بھرنش ابھی تک دھندلکے میں ہیں ۔ ان کا نقشہ حسبِ ذیل ہو سکتا ہے ۔

براچڈ اپ بھرنش : سندھی

ککیئی اپ بھرنش : لہندا دیس کا قدیم نام ککیئی تھا ۔ یہ براچڈ سے ملتی جلتی اپ بھرنش ہوگی ۔ اسی لئے سندھی اور لہندا (مغربی پنجابی) میں مماثلت پائی جاتی ہے ۔

مشرقی پنجابی کا تعلق بھی اسی ٹککی اَپ بھرنش سے تھا لیکن بعد کو اس پر شورسینی کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح گریرسن نے اس کا سلسلہ بھی شورسینی اَپ بھرنش سے ملا دیا۔ جدید پنجابی زبان کی ساخت اور پرداخت میں شورسینی اَپ بھرنش اور لہندا کی قدیم زبان کا کیا حصّہ ہے اس کا ذکر تفصیل سے آگے آئے گا۔

اَپ بھرنش کا باب ختم کرنے سے پہلے اس طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ جدید زبانوں کے رشتے ناتے قدیم پراکرتوں اور اَپ بھرنشوں سے اتنی آسانی سے نہیں ملائے جا سکتے، جتنا کہ بعض محققین نے سمجھ رکھا ہے مثلاً بہاری، بنگالی، اُڑیا اور آسامی زبانوں کا سلسلہ ماگدھی اَپ بھرنش سے ملایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب اگر صرف اس قدر ہے کہ ان تمام زبانوں میں ماگدھی اَپ بھرنش کے بعض اصول مشترک ہیں۔ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اگر اس سے مُراد یہ لی جائے کہ ۶۰۰ء سے ۱۰۰۰ء تک بہار، بنگال، آسام اور اُڑیسہ میں صرف ایک ہی بولی بولی جاتی تھی جس کی ادبی شکل ماگدھی اَپ بھرنش ہے۔ تو یہ نہ صرف غلط بلکہ لسانی اعتبار سے ناممکن ہوگا۔ اتنے بڑے علاقہ میں اگر ایک زبان بولنے والے پھیل بھی جائیں تب بھی صوبائی اختلافات کا پیدا ہو جانا لازمی امر ہے۔ یہی استدلال شورسینی اور اس سے متعلقہ زبانوں کے سلسلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ شورسینی پراکرت یا اَپ بھرنش سے موجودہ پنجابی، راجستھانی اور مغربی ہندی کی بولیاں نکلی ہوں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ شورسینی اَپ بھرنش، شورسین دیس (متھرا) کی قدیم بولی کی بنیاد پر بنی ہوئی ادبی زبان رہی ہوگی۔ اسی کے ساتھ ساتھ آس پاس کے علاقوں میں اس وقت جدید زبانوں کی قدیم شکلیں رائج ہوں گی جن کے نمونے آج نہیں ملتے۔ آج بھی کچھ ایسی ہی حالت نظر آتی ہے۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک ادبی حیثیت سے صرف ایک زبان استعمال میں

لائی جاتی ہے۔ اس زبان کی بنیاد اس بولی پر ہے جو دلّی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی
جاتی ہے یعنی کھڑی بولی۔ اس کے ساتھ ساتھ برج بھاشا، اودھی، بندیلی، بگھیلی، پنجابی
اور بہاری بولیاں آج بھی اپنے اپنے علاقوں کی زندہ زبانیں ہیں۔ لیکن چونکہ ان میں
سے کسی کو بھی ادبی مرتبہ حاصل نہیں۔ اس لئے آج سے دو سو سال بعد کے محقق کو
ان زبانوں کے علاقوں میں بھی صرف ادبی زبان (اُردو یا ہندی) کے نمونے
مل سکیں گے۔ کیا اس وقت یہ طریق استدلال صحیح ہوگا کہ چونکہ کھڑی بولی اتنے
بڑے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اس لئے اس علاقہ کی تمام بولیاں ضرور ہے کہ اسی
سے نکلی ہوں گی۔ یہاں یہ بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ادبی کھڑی بولی کو آج جتنا
عروج حاصل ہے۔ ہندوستان کی کسی زبان کو کسی زمانہ میں حاصل نہ تھا۔ اس کے باوجود
کھڑی بولی ابھی تک (قطع نظر شہر اور قصبات کے) مقامی بولیوں کی جگہ نہیں لے سکی
ہے۔ دراصل زبان کا جو نقشہ آج ہے وہی آج سے آٹھ سو برس پہلے تھا اور وہی
آج سے اٹھارہ سو برس پہلے (پراکرتوں کا طلوع) بھی تھا یعنی صوبائی اور مقامی
بولیوں کی کثرت کے درمیان ایک ادبی زبان کی وحدت!! یہ لسانی نقشہ سیاسی اُلٹ
پھیر کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ آریوں کے داخلۂ ہندوستان (۱۵۰۰ ق م) سے لے کر
مسلمانوں داخلۂ ہندوستان (۱۰۰۰ء) تک کی تاریخ مختلف سلطنتوں کے بننے اور
بگڑنے کی ایک طویل داستان ہے۔ جب علاقہ کے لوگ حکومت قائم کرنے میں کامیاب
ہو جاتے اس علاقہ کی زبان آناً فاناً شاہی سرپرستی میں ہندوستان کی معیاری زبان
کی حیثیت سے پھیل جاتی تھی۔ اشوک کا عہد اردھ ماگدھی پراکرت کے عروج کا زمانہ
تھا جس نے مغربی ہندوستان کی تمام پراکرتوں کو متاثر کیا۔ ہرش وردھن اور

راجپوتوں کی فتوحات کے ذریعے دوآبہ کی زبان پھر سر اُٹھاتی ہے اور پہلے شورسینی اَپ بھرنش اور بعد کو برج بھاشا کی شکل میں سارے ہندوستان کی مانی ہوئی ادبی زبان بن جاتی ہے۔ آج بھی اِسی دوآبہ کی ایک بولی یعنی کھڑی بولی ہندوستان کی لنگو افرینکا بنی ہوئی ہے، جو یقیناً اُس تاریخی حادثہ کا طفیل ہے کہ مسلمانوں نے دہلی کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔

دوسرا باب

ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانیں

ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں اور انکی گروہ بندی

۱۸۸۰ء میں سب سے پہلے ہارنل نے اس بات کی طرف اشارہ کیا تھا کہ ہندوستان کی موجودہ زبانوں کی ساخت اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ ہندوستان میں آریہ دو مختلف گروہوں میں داخل ہوئے ہونگے۔ آریوں کا دوسرا گروہ پہلے گروہ کے کافی عرصہ بعد آیا ہوگا لیکن وہ اُن سے ملتی جلتی آریائی زبانیں بولتا ہوگا۔ گریرسن، ہارنل کے اس نظریہ کو جوں کا توں تسلیم نہیں کرتا[۱]۔ تاریخی ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے وہ صرف ان گروہوں کے اختلاف زبان پر زور دینا کافی سمجھتا ہے۔ لیکن ہارنل کے خیال میں آریوں کا دوسرا دَل پنجاب کے میدانوں کو پار کرتا ہوا گنگا کی وادی تک جا پہنچتا ہے۔ اور پہلے آریہ دَل کو مشرق، جنوب اور مغرب پیچھے کس طرح ؟؟؟) کی طرف ڈھکیل دیتا ہے۔ گریرسن اس تاریخی مفروضہ سے اختلاف کرتے ہوئے دوسرے پہلو کے امکانات کو لسانی دلیلوں سے اُجاگر کرتا ہے۔ اس کے خیال میں نو وارد آریہ اپنا راستہ بند دیکھ کر بہت ممکن ہے پہلے آئے ہوئے آریوں کے چاروں طرف نیم دائرہ کی شکل میں پھیل گئے ہوں۔ پنجاب میں ان کا مقابلہ پُرانے آریوں سے ہوا ہوگا۔ جہاں

---

[۱] لسانیاتی جائزۂ ہند۔ جلد اوّل: حصہ اوّل: دیباچہ۔

سے شکست کھا کر انہیں اپنا رُخ سندھ کی وادی اور وہاں سے وسطی ہندوستان، مرہٹواڑی اور بہار اُڑیسہ کی طرف کرنا پڑا ہوگا۔ اس طرح نئے آریہ پرانوں کے اردگرد گھیرا ساڈال دیتے ہیں۔ ہارنل اور گریرسن دونوں کے بیانات سے یکساں نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ دونوں صورتوں میں آریوں کا ایک گروہ اندرونی بن جاتا ہے اور دوسرا اُن کے تین طرف نیم دائرہ کی شکل میں بیرونی۔ اگر ہارنل صحیح ہے تو نوارد آریہ اندرونی کہلائیں گے اور اگر گریرسن کی بات تسلیم کی جائے تو پرانے آریہ۔

ہارنل کے اس نظریہ یا گریرسن کی اندرونی و بیرونی تقسیم کا دھندلا سا روایتی ثبوت ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں مل جاتا ہے۔ بالخصوص مہابھارت کے اندر پنچالوں اور کوروں کی لڑائی درحقیقت دوآبہ کے آریوں اور نوارد آریوں کے درمیان سیاسی اقتدار کے لئے زور آزمائی تھی۔ پنچالوں کے حمایتی پانڈے تھے جو ایک کوہستانی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ پنچال کوروں کی بہ نسبت یہاں کے زیادہ پرانے نواسی تھے۔ اس لئے ان کے رنگ سیاسی مائل بتائے گئے ہیں، مہابھارت میں ان آریوں کو جو دریائے سندھ کے کنارے پر بستے تھے "ملیچھ" کے نام سے یاد کیا گیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ دوآبہ والے انہیں غیر آریہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد "مدھ دیش" (مغربی یو۔ پی اور مشرقی پنجاب) کے آریوں کا عروج ہوتا ہے وہ اپنے علاقہ سے مسلسل برابر مختلف سمتوں میں پھیلتے رہے۔ چنانچہ سنسکرتی عہد کے جغرافیہ میں جس علاقہ کا نام بار بار آیا ہے اور جسے خالص آریوں کی جنم بھومی ہونے کا فخر حاصل ہے، وہ یہی "مدھ دیش" ہے اس کی حد بندی شمال میں ہمالیہ، جنوب میں وندھیاچل اور پنجاب میں سرہند سے لے کر الہ آباد تک مقرر کی گئی ہے۔ ہندوؤں کی مذہبی روایات

کے مطابق اس کے مشرقی سرے سے مغربی سرے تک سرسوتی نام کا مقدّس دریا بہتا ہے۔ جوانسانی آنکھ سے اُوجھل ہے۔

گریرسن کی تقسیمِ زبان کے مطابق شمالی ہندوستان کی جدید آریائی زبانیں دو شاخوں میں بٹ جاتی ہیں۔ ایک اندرونی اور دوسری بیرونی۔ اندرونی زبانیں ٹھیک اس علاقے میں بولی جاتی ہیں جس کا ذکر اوپر "مدھ دیش" کے نام سے کیا جاچکا ہے۔ بیرونی شاخ کی زبانیں نیم دائرہ کی شکل میں مغربی پنجاب سے شروع ہو کر سندھ، مرہٹواڑی، وسطی ہندوستان اڑیسہ، بہار اور بنگال اور آسام تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اس سلسلہ کی کڑی صرف گجرات میں ٹوٹتی ہے۔ گجرات پر گریرسن کے خیال میں متھراوالوں کا سیاسی اقتدار کافی عرصے تک رہا۔ لہٰذا وہاں کی زبان مدھ دیش کی زبان سے اس درجہ متاثر ہوئی ہے کہ گریرسن موجودہ گجراتی کو اندرونی زبانوں کی صف میں جگہ دیتا ہے۔

گریرسن کی تقسیمِ زبان کا نقشہ

(۱) بیرونی زبانیں :-

(الف) شمال مغربی شاخ :

۱۔ لہندا (مغربی پنجاب)　　۲۔ سندھی

(ب) جنوبی شاخ :

۱۔ مرہٹی :

(ج) مشرقی شاخ :

۱۔ آسامی　۲۔ بنگالی　۳۔ اُڑیا　۴۔ بہاری

(۲) وسطی زبانیں :-

۱- پوربی ہندی

(۳) اندرونی زبانیں :-

۱- مغربی ہندی ۲- پنجابی (مشرقی) ۳- گجراتی ۴- راجستھانی
۵- بھیلی ۶- خاندیشی -

(۴) پہاڑی زبانیں :-

۱- مشرقی پہاڑی یا نیپالی ۲- درمیانی پہاڑی ۳- مغربی پہاڑی

اندرونی اور بیرونی زبانوں کی یہ گروہ بندی گریرسن نے ہارنلی کے برعکس زبانوں کی ساخت اور اُن کے کینڈوں پر غور کرنے کے بعد کی ہے۔ اس کے لسانیاتی دلائل کا خلاصہ یہ ہے۔[1]

(۱) دونوں گروہوں کی زبانوں میں تلفظ کا بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً اندرونی شاخ کی تمام زبانوں میں س کا تلفظ صحیح ہوتا ہے۔ اس کے برعکس بیرونی زبانوں میں یہ عام طور سے ش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ قدیم ایرانی میں یہی س، ہ میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ مثلاً سنسکرت (سپت) = فارسی (ہفت) س (سندھ) = ف (ہند) وغیرہ۔ تلفظ کی یہ خصوصیت ہندوستان کی شمال مغربی بولیوں میں بھی پائی جاتی ہے مغربی پنجابی اور سندھی میں (کوس) کا (کوہ) بن جاتا ہے۔ ادھر بنگالی اور مرہٹی میں س ہمیشہ ش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ بلکہ مشرقی بنگالی اور آسامی میں تو یہ چ اور س کی درمیانی

---

[1] گریرسن : لسانیاتی جائزۂ ہند۔ جلد اوّل : حصۂ اوّل۔

آواز بن جاتا ہے۔

(۲) اندرونی اور بیرونی زبانوں کے اسماء کی شکلیں بھی مختلف ہوتی ہیں تقریباً تمام اندرونی زبانوں میں ایسے حروف سے کام لیا جاتا ہے جو الفاظ کے ساتھ جوڑ دیئے جاتے ہیں مثلاً کا۔ کی۔ کے۔ کو سے۔ نے وغیرہ لیکن بیرونی زبانیں ان کی بہ نسبت زیادہ ترقی کر چکی ہیں۔ اور حالت تفصیلی (اناٹیکل اسٹیج) سے صورت ترکیبی (سنتھیٹک) میں پہونچ ہیں۔ لسانیات کا یہ اہم اصول ہے کہ زبانیں پہلے حالت تفصیلی میں ہوتی ہیں اور اس کے بعد رفتہ رفتہ شکل بدل کر ترکیبی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ تقریباً تمام اندرونی زبانیں حالت تفصیلی میں ہیں۔ مثلاً اُردو میں حالت فاعلی کا۔ کی۔ کے لگا کر بنائی جاتی ہے یہاں (کا) اسم سے الگ بھی ایک معنیٰ رکھتا ہے۔ لیکن بنگالی (بیرونی زبان) میں یہی (ار) لگا کر بنتی ہے۔ اور یہ علامت اس وقت اسم کا ایک جزو بن جاتی ہے۔

(۳) دونوں گروہوں کی زبانوں میں ایک اور بھی نمایاں فرق نظر آتا ہے' بیرونی زبانوں کے فعل ماضی سے اس کے فاعل کی تجنیس اور تعداد کا پتہ بھی چل جاتا ہے۔ لیکن اندرونی زبانوں میں ہر قسم کے فاعل کے ساتھ فعل کی ایک ہی شکل رہتی ہے۔ مثلاً اُردو میں (میں گیا)۔ (تو گیا)۔ (وہ گیا)۔ یہاں فعل "گیا" یکساں رہتا ہے۔ لیکن بنگالی کے لفظ "ماری لام" سے فوراً پتہ چل جاتا ہے کہ مارنے والا (میں) ہے۔ جبکہ اُردو کے (مارا) سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ میں نے مارا' یا تو نے مارا' یا اُس نے مارا۔

گریرسن نے اس سلسلہ میں تاریخی استدلال بہت کم پیش کیا ہے۔ صرف مذکورہ بالا لسانی مفروضات پر وہ زبانوں کی اس گروہ بندی کو صحیح سمجھتا ہے لسانیا/ دنیا میں گریرسن کی تحقیق کے اس حصہ سے جتنا اختلاف کیا گیا ہے اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آریائی زبانوں کے نئے

محققوں نے مبسوط لسانیاتی دلائل سے گریرسن کے اس نظریہ کا بطلان پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر چیٹرجی کا نام پیش پیش ہے۔ بی مزمدار کا خیال ہے کہ گریرسن ہندوستان کی قدیم زبانوں سے کماحقہ واقف نہ تھا اس لئے اس کے لسانیاتی فیصلے قول فیصل کا حکم نہیں رکھتے[1]۔ ان کا خیال ہے کہ گریرسن نے اپنے نظریہ کی تائید میں فرہنگ اور صوتیات پر غیر معمولی زور دیا ہے حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ زبان کے کینڈے کو سمجھنے میں اُن سے کہیں زیادہ اس کے صرفی اور نحوی قاعدوں سے مدد ملتی ہے۔

گریرسن کے بعض لسانی دلائل کا بطلان :-

(۱) س کا ہ میں تبدیل ہو جانا بیرونی زبانوں کی خصوصیت نہیں ہے۔ اسکی مثالیں خود مغربی ہندی (خالص اندرونی زبان) میں مل جاتی ہیں۔ جیسے: سنسکرت، تسیہ۔ تس۔ تاس۔ تاہ۔ تا (تاکو۔ تاہی وغیرہ برج بھاشا میں آج بھی بولتے ہیں) اسی طرح سنسکرت :۔ کرشیتی۔ کرسیدی۔ کرسئی۔ کرہی ہئ (اپ بھرنش) کرہی ہے۔ برج بھاشا میں بن جاتا ہے بعلاوہ ازیں بیرونی زبانوں میں اکثر جگہ س کا استعمال پایا جاتا ہے۔ مثلاً راجستھانی (کرسی) لہندا (مغربی پنجابی) (کرےسی) = کرے گا۔ اس طرح تقریباً تمام جدید آریائی زبانوں میں (اندرونی اور بیرونی دونوں) اعداد کا س، ہ میں تبدیل ہو جاتا ہے جیسے۔ گیارہ، بارہ، چوہتر (چوہتّر)۔ گجراتی (جسے گریرسن زبانوں کی اندرونی صف میں جگہ دیتا ہے) کی بعض بولیوں میں س، ہ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مثلاً سنسکرت: سپت۔ اُردو: سات۔ گجراتی: ہات[2]۔

---

[1] بنگالی زبان کی تاریخ: بی مزمدار صفحہ ۷

[2] آسان گجراتی گرامر: ٹِسڈل۔

(۲) بیرونی زبانوں کی طرح مغربی ہندی میں بھی علامتوں کا ہمیشہ خیال نہیں رکھا جاتا۔ بنگالی اور مرہٹی کی طرح اس میں بھی بعض اوقات لفظ کو توڑ مروڑ کر علامتوں کا مفہوم نکال لیا جاتا ہے مثلاً اردو میں "آنکھوں" بمعنی "آنکھوں سے"

ع خسرو وا کو آنکھوں دیکھا۔ (امیر خسرو) بمعنی آنکھوں سے دیکھا۔

پرانی اردو میں (میں نے) کی جگہ ہمیشہ (میں) استعمال ہوتا تھا۔ اپ بھرنش کی یہ روایت میر و سودا کے زمانہ تک قائم رہی ہے۔ اسی طرح اردو میں: وہ بھوکوں مرگیا' برج بھاشا: یا بھوکن مرگیو' بہ معنی 'بھوکوں سے مرگیا۔' "سے" کا مفہوم ان جملوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس کے برعکس لہندا میں (مغربی پنجابی) جسے گریرسن بیرونی زبانوں میں شمار کرتے ہیں۔ علامتیں علیحدہ سے لگائی جاتی ہیں۔ مثلاً (گھوڑے دا) بمعنی (گھوڑے کا) یا (گھوڑے نوں) بمعنی (گھوڑے کو)

اس سے ثابت ہوجاتا ہے کہ جن لسانی اصولوں کو بیرونی زبانوں کی خصوصیت گردانا گیا ہے وہ تھوڑی بہت اندرونی زبانوں میں بھی پائی جاتی ہیں' بیرونی زبانوں میں بعض خصوصیات ایسی بھی ہیں جو جنوبی اور مشرقی ہندوستان کی بیرونی زبانوں میں تو مشترک ہیں' لیکن مغربی ہندوستان کی بیرونی شاخ میں نہیں پائی جاتیں۔ مثلاً ان زبانوں میں ماضی مطلق کی علامت ل ہے۔ (اٹھا) کے لئے مرہٹی (اٹھیلا)[1]، بنگالی (اٹھیل)[2]، بہاری (اٹھل) آسامی (اٹھل)، اڑیا (اٹھیلا) لیکن شمال مغربی ہندوستان کی علامت ماضی ل نہیں۔

چنانچہ ہمیں یہاں پر گریرسن سے اختلاف کرتے ہوئے چیٹرجی[3] کی اس رائے سے متفق

---

[1] مادھیا مک دیا کرن: (مرہٹی گرامر) شیو نرائن گوکھلے۔

[2] بنگالی سیلف ٹاٹ: چیٹرجی صفحہ ۱۳۱

[3] بنگالی زبان کی ابتدا اور ارتقا صفحہ ۳۳

ہونا پڑتا ہے کہ اندرونی 'بیرونی زبانوں کی یہ تقسیم لسانی اعتبار سے اتنی ہی مہمل ہے جتنی کہ تاریخی استدلال سے۔

اب ہم ڈاکٹر چٹرجی کے لسانی نقشہ میں تھوڑی سی ترمیم کرنے کے بعد ہندوستان کی جدید زبانوں کی گروہ بندی حسب ذیل طریقے پر کرتے ہیں :۔

(الف) مدھ دیش کی زبان خاص :۔

۱۔ مغربی ہندی۔

(ب) درمیانی زبانیں :

(۱) مدھ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں :۔

(۱) پنجابی، ۲۔ راجستھانی، ۳۔ گجراتی، ۴۔ پہاڑی بولیاں،

(۲) بیرونی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان :۔

۱۔ پوربی ہندی،

(ج) شمال مغربی ہندوستان کی زبانیں :۔

۱۔ لہندا (مغربی پنجابی) ۲۔ سندھی

(د) مشرقی ہندوستان کی زبانیں۔

۱۔ بہاری، ۲۔ اڑیا، ۳۔ بنگالی، ۴۔ آسامی۔

(ہ) جنوبی ہندوستان کی آریائی زبانیں۔

۱۔ مرہٹی

مذکورہ بالا زبانوں کی تفصیلات[1]۔

---

[1] یہ تفصیلات عام طور سے گریرسن کے "لسانیاتی جائزۂ ہند" پر مبنی ہیں۔ اردو اور اس کی ہمسایہ بولیوں پر ایک نہایت مفید چھوٹی سی کتاب ہندی میں ڈاکٹر دھریندر ورما نے بھی لکھی ہے۔ نام گرامین (دیہاتی) ہندی۔

شمال مغربی ہندوستان کی زبانیں:۔

لہندا:۔ یہ مغربی پنجاب کی زبان ہے۔ اس کے اور مشرقی پنجابی کے حدود کچھ اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ بعض سرحدی اضلاع کے اندر دونوں میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لہندا پر دردیا پشاچ زبانوں کا اثر بہت زیادہ پڑا ہے، مغربی پنجاب میں "کیکئے" دیس بھی شامل ہے جہاں قدیم زمانے میں پشاچی پراکرت اور براچڈ اپ بھرنش بولی جاتی تھیں۔ لہندا مغربی پنجابی، جاٹکی، ہندکی یا اچی کے ناموں سے بھی مشہور ہے۔ لیکن ان میں سب سے بہتر نام لہندا ہی ہے۔ اس کے معنی "سمتِ مغرب" کے ہیں۔ لہندا میں کوئی ادبی کارنامہ نہیں ملتا۔ یہ اپنی گرامر اور فرہنگ دونوں کے اعتبار سے مشرقی پنجابی سے مختلف ہے۔ اس کا اپنا رسم الخط لنڈا ہے۔ لیکن آج کل یہ فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

(۲) سندھی: یہ صوبہ سندھ کی بولی ہے۔ اس کے بولنے والوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ اس لئے اس میں عربی فارسی کے الفاظ بہ کثرت استعمال کئے جاتے ہیں۔ اس کا رسم الخط بھی عربی ہے۔ اس کی پانچ بولیاں ہیں۔ جن میں سے وسطی علاقہ کی "بچول" بولی نے تھوڑی بہت ادبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سندھ کو پرانے زمانہ میں براچڈ دیس کہا جاتا تھا۔ اسی لئے موجودہ سندھی کا تعلق براچڈ اپ بھرنش سے ہے۔

لہندا اور سندھی دونوں دوآبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں اس لئے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جا سکتا۔ گو مسلمان اوّل اوّل انہیں زبانوں کے علاقے میں داخل ہوئے تھے۔

جنوبی ہندوستان کی آریائی زبان

(۱) مرہٹی: یہ صوبہ بمبئی، پونا کے آس پاس، برار، سی پی کے جنوبی اضلاع ناگپور

وغیرہ اور حیدر آباد کے شمال مغربی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ اس کے جنوب میں دراوڑ زبانوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں۔ جن میں سے پونا کے اطراف کی بولی نے ادبی مرہٹی کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ اس کا رسم الخط دیوناگری ہے۔ اور ادبی سرمایہ کے اعتبار سے یہ ہندوستان کی ممتاز ترین زبانوں میں شمار کی جاتی ہے۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں میں گجراتی کے علاوہ مرہٹی ایک ایسی زبان ہے جس میں صیغہ تثنیہ ملتا ہے۔ یہ پنجابی اور گجراتی کی طرح برج بھاشا کے برعکس و اور ب کے تلفظ میں فرق کرتی ہے۔ مغربی ہندی کی طرح اسماء کا اختتام اس میں بھی (پ) ہوتا ہے اور جمع (اے) جوڑ کر بنائی جاتی ہے۔

دکنی کی ساخت پرداخت میں اس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ اس کے بعض اسماء، حروف اور افعال دکنی میں مستعمل ہیں۔ مثلاً: کیتک = کئی ایک (فرہنگ قطب مشتری)، بسلا، بیٹھا (فرہنگ نصرتی)؛ بسلانا = بٹھانا (ف۔ ق۔ م) نکو = نہیں (فرہنگ سب رس) یا زور اور تاکید کے لئے "چ" کا استعمال مثلاً۔ آپیچ (آپ ہی: فرہنگ سب رس) وغیرہ۔ دکنی میں سنسکرت اور اپ بھرنش کے الفاظ کا جو عام رجحان ملتا ہے اس کی تائید مرہٹی سے بھی ہوتی ہے۔

مشرقی ہندوستان کی زبانیں:-

(۱) آسامی: آسامی پر ہندوستان کی آریائی زبانوں کا مشرق میں سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ اڑیا کی طرح آسامی بھی بنگالی کی بہن ہے نہ کہ بیٹی۔ اگرچہ آسامی قواعد بنگالی سے زیادہ مختلف نہیں لیکن دونوں کے ادبی رجحانات میں کافی اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۲) بنگالی: یہ موجودہ بنگال، سلہٹ اور بہار کے مشرقی اضلاع کی زبان ہے۔

دیہاتی بنگالی اور شہری بنگالی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ادبی بنگالی میں سنسکرت کے خالص الفاظ کی جتنی بھرمار ملتی ہے اس کی مثال اگر ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں ملتی ہے تو وہ نئی ہندی ہے۔ مشرقی بنگال کا مرکز ڈھاکہ ہے۔ موجودہ ادبی زبان کی نیو بنگالی کے اس روپ پر ہے جو ہگلی کے آس پاس بولی جاتی ہے۔ بنگالی صوتیات کی خصوصیات یہ ہیں کہ (ا) کا (او) اور س کا ش ہو جاتا ہے۔ بنگالی رسم الخط براہمی ہی کی ایک شکل ہے۔

(۳) اُڑیا:۔ یہ اڑیسہ (قدیم اُت کل دیس) میں بولی جاتی ہے۔ اس لئے اس کو اُتکلی یا اوڈری بھی کہتے ہیں۔ اڑیا رسم الخط بہت مشکل ہے۔ اس کی قواعد بنگالی سے ملتی جلتی ہے۔ اس لئے بنگال کے پنڈت عرصے تک اُسے بنگالی زبان کی ایک بولی گردانتے رہے۔ لیکن یہ غلطی تھی۔ اڑیا دراصل بنگالی کے ساتھ ساتھ بارہویں صدی عیسوی میں ماگدھی اَپ بھرنش سے جنم لیتی ہے۔ بنگالی اور اُڑیا کا رشتہ ماں بیٹی کا نہیں، بہنوں کا ہے۔ مرہٹوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے اس میں مرہٹی کے بھی الفاظ کثرت سے ملتے ہیں۔

(۴) بہاری:۔ تمدّنی اعتبار سے صوبہ بہار کا تعلّق یو۔پی سے رہا ہے۔ لیکن لسانی اعتبار سے اس کی بولیاں بنگالی سے زیادہ قریب ہیں۔ بنگالیؔ اُڑیاؔ اور آسامیؔ کی طرح اس کی پیدائش بھی ماگدھی اَپ بھرنش سے ہوئی ہے۔ بلکہ ایک لحاظ سے یہ ماگدھی اَپ بھرنش کی سچّی جانشین ہے کیونکہ یہ اُسی علاقے میں بولی جاتی ہے۔ بہاری کی تین بولیاں قابلِ ذکر ہیں۔

(۱) میتھلی: جو گنگا کے شمال میں دربھنگہ کے آس پاس بولی جاتی ہے۔

(۲) مگھی: جس کا مرکز پٹنہ اور گیا سمجھنا چاہیئے۔

---

(۳) بھوجپوری: جو یو۔پی کی گورکھپور اور بنارس کی کمشنریوں اور بہار کے شاہ آباد۔ چمپارن وغیرہ کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

ان میں میتھلی اور مگہی ایک دوسرے سے قریب اور بھوج پوری دونوں سے کسی قدر مختلف ہے۔ ڈاکٹر چیٹرجی، بھوج پوری کو میتھلی اور مگہی سے اس قدر مختلف مانتے ہیں کہ وہ اُسے بہاری بولیوں سے علیحدہ شمار کرتے ہیں۔ بہار میں تین رسم الخط رائج ہیں۔ لکھائی چھپائی میں دیوناگری کا استعمال ہوتا ہے۔ عام تحریر میں کیتھی رسم الخط برتا جاتا ہے۔ ان کے علاوہ میتھلی برہمنوں کا ایک رسم الخط بھی ہے جسے میتھلی کہتے ہیں، جو بنگالی رسم الخط سے ملتا جلتا ہے۔ اس علاقہ کی ادبی زبانیں اُردو اور ہندی ہیں۔

مشرقی ہندوستان کی زبانوں سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبان

مشرقی ہندی: مشرقی یا پوربی ہندی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے مغربی ہندی کے پورب میں بولی جاتی ہے۔ یہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے مغربی ہندی سے ملتی جلتی ہے اور بعض دوسری خصوصیات کے لحاظ سے بہاری سے۔ لیکن اس کا گہرا رشتہ مشرقی ہندوستان کی زبانوں (بہاری بنگالی وغیرہ) ہی سے ہے۔ اس کی تین خاص بولیاں ہیں، (۱) اودھی (۲) بگھیلی (۳) چھتیس گڑھی۔ کوسلی اودھی کا دوسرا نام ہے۔ کیلاگ[1] اور گریرسن نے سب سے پہلے مشرقی ہندی کو ایک علیحدہ زبان کی حیثیت دی ہے۔ اس سے قبل اُسے ہندی ہی کی ایک شاخ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے افعال پر مغربی ہندی کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ لیکن اسماء اور ضمائر کے اعتبار سے یہ ہندوستان کی مشرقی زبانوں سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔ مغربی اودھی میں فعل کی معمولی شکل برج بھاشا کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے (آون، جاون، کرن) لیکن مشرقی اودھی میں فعل کے آخر میں ب آتی ہے۔ جیسے (آوب، جاب، کرب) فعلِ ماضی میں

---

[1] ہندی گرامر: کیلاگ: دیباچہ

اس میں مشرقی ہندوستان کی دیگر زبانوں کی طرح س آتا ہے جیسے مارس، کیس وغیرہ۔

مشرقی ہندی کی سب سے اہم بولی اودھی کو ہندی ادب میں ایک خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس کے دو مشہور شاعر ملک محمد جائسی اور تلسی داس ہیں جو ہندی ادب کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔

مدھ دیش کی زبان سے گہرا رشتہ رکھنے والی زبانیں

پہاڑی بولیاں :-

پوربی پہاڑی : یہ نیپال میں بولی جاتی ہے۔ اس کو نیپالی، پربتیا، گورکھالی اور سکھ کرا بھی کہتے ہیں۔ اس کا سب سے نکھرا روپ کاٹھمنڈو کی گھاٹی میں بولا جاتا ہے۔ یہ دیوناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔

درمیانی پہاڑی : اس کی دو شکلیں ہیں۔

(١) کمایونی جو الموڑہ، نینی تال کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔

(٢) گڑھوالی جو ریاست گڑھوال اور مسوری کے پہاڑی علاقے میں بولی جاتی ہے

مغربی پہاڑی : اس زبان کی کئی بولیاں ہیں جو شملہ اور اس کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں بولی جاتی ہیں۔ اس علاقہ میں تقریباً بیس بولیاں رائج ہیں ان میں تحریری ادب نہیں ملتا۔

مذکورہ بالا سب پہاڑی زبانیں راجستھانی سے بہت زیادہ ملتی جلتی ہیں، خاص طور سے درمیانی پہاڑی کا تعلق جے پوری اور مغربی پہاڑی کا تعلق مارواڑی سے زیادہ قریب کا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مسلمانوں کے عہد میں اکثر راجپوت قبائل راجپوتانے سے نکل کر یہاں بس گئے تھے۔ اسی وجہ سے یہاں کی بولیوں پر راجستھانی زبان کا گہرا اثر پڑا۔

گجراتی : گجراتی زبان کاٹھیاواڑ، ریاست بڑودہ اور اس کے آس پاس کے اضلاع

میں بولی جاتی ہے۔ اس کی مختلف بولیوں میں دوسری زبانوں کی طرح زیادہ اختلاف نہیں پایا جاتا۔ گجراتی زبان کا یہ نام گوجروں کی نسبت سے ہے جو ۵۰۰ء تا ۶۰۰ء میں ہندوستان کے مختلف صوبوں میں باہر سے آکر بس گئے تھے۔ پنجاب کے دو شہر گجرانوالہ اور گجرات کے نام انہیں گوجروں کی نسبت سے پڑے۔ یہ گوجر بعد کو گجرات میں بھی جا کر بس گئے تھے۔

مغربی ہندی، راجستھانی اور پنجابی کی طرح گجراتی کو بھی گریرسن اندرونی زبانوں کی فہرست میں جگہ دیتا ہے۔ اصل گجرات کی اصل زبان بیرونی شاخ سے تعلق رکھتی تھی جس کے بعض لسانی اثرات اب تک اس زبان میں پائے جاتے ہیں، مثلاً (۱) س اور ہ کے تلفظ کا ادا نہ کرسکنا (۲)، اسمار کی غیر فاعلی حالت میں (۱) کا برقرار رکھنا (۳) ماضی مطلق میں (ل) علامت کا مرہٹی اور مشرقی ہندستان کی زبانوں کی طرح استعمال۔

ویدی زمانہ سے موجودہ عہد تک گجراتی زبان کے تسلسل کی جس طرح نشان دہی کی جاسکتی ہے اس کی نظیر ہمیں ہندستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ملتی۔ راجپوتوں کے عہد میں متھراوالوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے جدید گجراتی اپنے قواعد کے اعتبار سے مغربی ہندی بالخصوص برج بھاشا سے کافی متاثر ہے۔ اسمار اور افعال کے اعتبار سے یہ مغربی ہندی کی پیروی کرتی ہے۔ لیکن اردو کی (ڑ) اور (ڑھ) کے مقابلے میں، اس میں، (ڈ) اور (ڈھ) زیادہ پائے جاتے ہیں، جو دکنی کی بھی عام خصوصیت ہے۔

راجستھانی: ایک طرح سے یہ مدھ دیش کی زبان ہی کا جنوب مغربی پھیلاؤ ہے۔ اس پھیلاؤ کی آخری کڑی جیسا کہ لکھا جا چکا ہے گجراتی زبان ہے۔ جس علاقے میں آج کل پنجابی (مشرقی)، گجراتی اور راجستھانی زبانیں (جن کا شمار گریرسن اندرونی زبانوں میں کرتا ہے)

بولی جاتی ہیں۔ وہاں قدیم زمانہ میں بیرونی شاخ کی زبانیں رائج تھیں۔ رفتہ رفتہ سیاسی فتوحات کی بنا پر اندرونی زبانوں نے ان علاقوں کی زبانوں کو ڈھکیلنا شروع کیا۔ لیکن گجراتی اور پنجابی کی طرح راجستھانی میں بھی بیرونی زبانوں کے بعض نشانات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً (اَ)، (اِ)، (اِے) اور (اُو) کا تلفظ عام تلفظ سے قدرے مختلف ہوتا ہے۔ اسی طرح (چھ) کا تلفظ س سے ملتا جلتا ہوتا ہے اور س کی آواز عام طور سے ہ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

راجستھانی کی چار اہم بولیاں ہیں۔

(۱) مارواڑی یا میواڑی: یہ جودھ پور، بیکانیر، جیسلمیر اور اودے پور کی ریاستوں میں بولی جاتی ہے۔

(۲) مالوی: اس کا مرکز موجودہ ریاست اندور ہے۔

(۳) جے پوری: یہ جے پور، کوٹہ اور بوندی کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔

(۴) میواتی: یہ الور اور دہلی کے جنوب میں گوڑگاؤں میں بولی جاتی ہے۔ قدیم اُردو کی ساخت پرداخت میں اس کا بھی حصّہ رہا ہے حالانکہ اس پر تحقیق کم ہوئی ہے کیونکہ ادبی اعتبار سے یہ بولی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اُردو پر بانگڑو زبان کے اثرات کے سلسلے میں، کسی اگلے باب میں، اس کے لسانی اثرات کو بھی پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

راجستھانی کے علاقوں میں اُردو ہندی ادبی زبانوں کی حیثیت سے رائج ہیں، اس کا قدیم ادب زیادہ تر مارواڑی میں ملتا ہے۔ پُرانی مارواڑی اور گجراتی میں بہت کم فرق ہے۔ اس کا قدیم ادب ڈنگل (برج بھاشا پنگل) کے نام سے مشہور ہے۔ جے پوری میں بھی ادب ملتا ہے۔ دادو دیال اور اُن کے چیلوں نے اسی میں شاعری کی ہے۔ اِن چاروں بولیوں کی ساخت

پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جے پوری اور مارواڑی، گجراتی سے۔ اور میواتی برج بھاشا سے۔ اور مالوی بندیل کھنڈی سے ملتی جلتی ہیں۔ راجستھانی کے بیشتر افعال مغربی ہندی کے نہج پر ہوتے ہیں۔ برج بھاشا کی طرح مستقبل کے لئے اس میں بھی دو علامتیں مستعمل ہیں۔ (ہوں) اور (گو) یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ علامت مستقبل (گ) جسے پروفیسر شیرانی پنجابی کی خصوصیت بتاتے ہیں (گو) یا (گ) کی شکل لے کر برج اور راجستھانی کی بعض بولیوں میں بھی مستعمل ہے۔ لیکن جملوں کی ترتیب الفاظ کی دروبست اور بعض صرفی ونحوی قاعدوں کے اعتبار سے اس میں اور گجراتی میں گہری مماثلت دکھائی دیتی ہے۔

پنجابی:۔ لفظ پنجابی کا اطلاق عام طور سے اُن تمام بولیوں پر کیا جاتا ہے جو دریائے سندھ سے لے کر ضلع انبالہ تک بولی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے گریرسن نے اپنے لسانی جائزہ میں اس بات کو واضح کیا تھا کہ لاہور کے مغرب میں جو زبان بولی جاتی ہے وہ اپنی ساخت کے اعتبار سے اندرونی بولیوں سے بالکل مختلف ہے وہ اس زبان کو لہندا یا مغربی پنجابی کا نام دیتا ہے۔ اور اُسے بیرونی زبانوں کی فہرست میں جگہ دیتا ہے۔ اس طرح اُس نے مغربی پنجابی اور پنجابی (مشرقی) میں امتیاز کیا ہے۔ پنجابی پورے پنجاب کی زبان نہیں۔ یہ مشرقی پنجاب، ریاست بیکانیر کے شمالی اضلاع اور ریاست جموّں کے جنوبی اضلاع کی زبان ہے۔ مغرب میں یہ لہندا یا مغربی پنجابی، شمال اور شمال مشرق میں، پہاڑی زبانوں اور جنوب میں راجستھانی کی باگڑ اور بیکانیری بولیوں سے گھری ہوئی ہے۔ مشرق میں اس کے حدود مغربی ہندی کی دو بولیوں یعنی کھڑی بولی اور بانگرو (ہریانی) سے ملتے ہیں۔ چنانچہ مشرقی انبالہ، کرنال، ریاست پٹیالہ، ضلع حصار کے مشرقی حصے، رہتک، گوڑگاؤں اور ضلع دہلی کی زبان پنجابی نہیں۔ بلکہ کھڑی بولی (ہندوستانی) یا ہریانی ہے۔ ان علاقوں کو چھوڑ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ سارے مشرقی

پنجاب کی زبان پنجابی ہے۔ پنجابی اور مغربی ہندی کی بولیوں کے درمیان حد بندی دریائے گھگھر سے کی جاسکتی ہے۔ دریائے گھگھر کے مشرق میں چند سکھ آبادیوں کو چھوڑ کر باقی سارے علاقہ کی زبان کھڑی بولی یا بانگڑو (ہریانی) ہے۔

پروفیسر محمود شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" لکھتے وقت اس لسانیاتی حقیقت کو بالکل فراموش کر دیا ہے کہ گجراتی اور راجستھانی کی طرح پنجابی زبان کا تعلق بھی قدیم زمانہ میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا۔ جس کے نشانات جدید پنجابی تک میں ملتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موجودہ پنجابی کی ساخت اس بات کا بھی پتہ دیتی ہے کہ اس پر کسی نہ کسی زمانہ میں اندرونی زبان (مدھ دیش کی زبان جس کی نمائندہ بولیاں آج کل برج بھاشا اور کھڑی بولی ہیں) کی چھاپ نہایت گہری پڑ چکی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں اس بات سے ملتا ہے کہ لہندا اور پنجابی کے درمیان خطِ فاصل قائم کرنا نہایت دشوار ہے۔ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقہ پر گھل مل جاتی ہیں کہ گریرسن کو یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ دراصل کسی زمانہ میں سارے پنجاب پر لہندا کی ایک نہ ایک شکل چھائی ہوئی تھی۔ جسے اندرونی زبان نے (شاید ہندوستانی کی کسی قدیم شکل نے) پیچھے دھکیلنا شروع کیا اور رچناو دوآب تک ہٹا دیا[1]۔ اس اندرونی زبان کے نشانات لہندا میں سندھ ساگر دوآب تک پائے جاتے ہیں۔ اندرونی زبان کا رنگ جوں جوں ہم مشرق کی طرف آتے ہیں گہرا ہوتا چلا جاتا ہے۔ اِسی لئے پنجابی کو گجراتی اور راجستھانی کی طرح ملواں زبان مانا گیا ہے۔ اور اُسے گریرسن نے اپنی بعد کی تحریروں میں صاف طور سے زبانوں کی درمیانی صف میں جگہ دی ہے۔ اس کی تائید میں اس تاریخی حقیقت کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ فتوحات کا

---

[1] لسانیاتی جائزہ ہند: جلد نہم: حصہ اوّل صفحہ ۶۱۴

بہاؤ ہمیشہ شمال مغرب سے دوآبہ کی طرف رہا ہے۔ لیکن سیاسی اقتدار کا مرکز ہر عہد میں گنگا، جمنا کے میدانوں میں رہا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا رہا ہے کہ دوآبہ کی زبانیں اپنے تنگ علاقوں سے نکل کر آس پاس کی زبانوں پر چھاپہ مارتی رہی ہیں۔ اور اس طرح ان کی اثر انداز ہوتی رہی ہیں مسلم عہد میں تو پنجاب اور گجرات کی حیثیت ہمیشہ صوبوں کی رہی ہے جو ہمیشہ مرکز سے تمدنی اور لسانی اثرات قبول کرتے رہے ہیں۔

گریرسن کے خیال میں معیاری پنجابی باری دوآب کی بولی "ماجھی" ہے جس کا مرکز امرتسر ہے۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس زبان کے ابتدائی یورپی اسکالروں نے لدھیانہ کی زبان کو معیاری پنجابی مانا ہے۔ لدھیانہ عرصہ تک انگریز مشنریوں کا اڈا رہا ہے اس لئے انہوں نے قواعد لکھتے وقت وہیں کی زبان کو ملحوظ رکھا ہے۔ مخی (سر پیرل) (ل) جس کا ذکر اُن قواعد میں ملتا ہے ماجھی میں اس کا نام و نشان بھی نہیں۔ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب جس کا ترجمہ ماجھی میں کیا گیا ہے اس میں یہ (ل) ایک جگہ بھی نہیں ملتا۔ مخی (سر پیرل) (ل) برج بھاشا میں بھی نہیں ملتا۔ البتہ مشرقی پنجاب کھڑی بولی، اور بانگڑو (ہریانی) کے علاقوں میں یہ سننے میں آتا ہے۔ بانگڑو سے منتقل ہو کر یہ راجستھانی میں بھی آ گیا ہے۔ ادبی اُردو اور ہندی میں تو اس کا استعمال گنوارو سمجھا جاتا تھا۔ اس اعتبار سے اُردو برج بھاشا کی پیرو ہے۔

مغربی ہندی اور اُس کی بولیاں

مغربی ہندی کے حدود تقریباً وہی ہیں جو مدھ دیش کے ہیں۔ یہ مغرب میں سرہند سے لے کر مشرق میں الہ آباد تک اور شمال میں ہمالیہ کے دامن سے لے کر جنوب میں وندھیاچل اور بندیلکھنڈ تک بولی جاتی ہے۔ اس کے شمال مغرب میں پنجابی زبان ہے۔ اور جنوب و جنوب مشرق میں، مرہٹی اور مشرقی ہندی۔ شمال میں یہ پہاڑی بولیوں (جونسری۔ گڑھوالی اور کمایونی) سے گھری ہوئی ہے۔ اندرونی زبان کی شاخ میں، صرف مغربی ہندی ایک ایسی زبان ہے جسے ہم خالص اندرونی زبان کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اگر پنجابی، راجستھانی اور گجراتی کی ملواں حیثیت پر نظر رکھیں، تو اندرونی گروہ کی نمائندہ زبان محض مغربی ہندی ہو سکتی ہے۔ مغربی ہندی کا یہ نام مدھ دیش کی زبان کو گریرسن نے دیا ہے جس نے سب سے پہلے مشرقی اور مغربی ہندی میں فرق کیا ہے۔ مغربی ہندی مدھ دیش کی زبان ہونے کی وجہ سے ہند آریائی زبان کی بہترین نمائندہ ہے کیونکہ اسی علاقہ میں سنسکرت، شورسینی پراکرت اور شورسینی اپبھرنش پروان چڑھتی ہیں۔ جن کی سچی جانشین اس علاقے کی جدید بولیاں (کھڑی بولی (ہندوستانی)، برج بھاشا، ہریانی وغیرہ) ہیں۔ جن کے مجموعہ کو گریرسن مغربی ہندی کا جدید نام دیتا ہے۔

لسانیاتی اعتبار سے مغربی ہندی کا تعلق براہِ راست شورسینی اَپ بھرنش سے ہے جو اس عہد کی بولیوں میں، واحد اور ممتاز ادبی حیثیت کی مالک تھی۔ جس نے سب سے زیادہ سنسکرت کے اثر کو قبول کیا تھا ہر عہد میں، اس علاقے کی زبان کا مرکز متھرا رہا ہے جو قدیم ہندی تمدن کا اہم ترین مرکز تھا۔ اس سے قبل اَپ بھرنش کے باب میں یہ لکھا جا چکا ہے کہ یہ اَپ بھرنش راجپوتی عہد میں مسلمہ طور سے لاہور سے لے کر بنگال تک ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی قدیم بنگالی شاعری کے نمونے اس بات کے شاہد ہیں۔ مغرب میں اس کی شمال مغربی بولیاں (کھڑی بولی اور ہریانی) اپنے اپنے علاقوں سے نکل کر لاہور تک دھاوے مارتی تھیں، جس کا نتیجہ آج ہم مشرقی پنجابی کی شکل میں پاتے ہیں جنوب مغرب میں گجراتی اور راجستھانی زبانوں کی نوعیت کچھ اسی قسم کی ہے جو کسی زمانہ میں بیرونی زبانوں سے تعلق رکھتی تھیں لیکن جن پر شورسینی اَپ بھرنش کا اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ اُن کا شمار اندرونی زبانوں میں کیا جا سکتا ہے۔

مغربی ہندی اور اُس کی بولیوں کی اپنی صوتی اور صرفی ونحوی خصوصیات ہیں جن کی بنا پر اس زبان کو ایک علیحدہ اور ممتاز حیثیت دی گئی ہے اور جن کا تفصیلی مطالعہ کسی بعد کے باب میں کیا جائے گا لیکن مغربی ہندی کی سب سے بڑی خصوصیت (جو کہ اس کی تمام بولیوں کی مشترک خصوصیت بھی ہے) کا یہاں، ذکر کر دینا ضروری ہے اندرونی زبانوں میں، مغربی ہندی کی یہ ممتاز حیثیت ہے کہ اس کی قواعد کا عام رجحان تفصیلی ہے۔ جو بعض بولیوں (مثلاً کھڑی) میں، اپنی انتہا تک پہونچ گیا ہے۔ اس میں، صحیح معنوں میں صرف ایک زمانہ فعل کے لیئے اور صرف ایک حالت اسماء کے لئے پائی جاتی ہے۔ اسماء اور افعال کی دیگر تمام حالتیں، حروف، فعل امدادی اور سابقون

یا لاحقوں کی مدد سے بنائی جاتی ہیں۔

گریرسن نے مغربی ہندی کی پانچ بولیاں گنائی ہیں، جنکے نام حسبِ ذیل ہیں

(۱) کھڑی بولی یا ہندوستانی (۲) ہریانی لجاٹو یا بانگڑو (۳) برج بھاشا (۴) قنوجی

(۵) بندیلی۔

شورسینی اپ بھرنش اپنے آخری دور میں، دو نمایاں شکلیں اختیار کر لیتی ہے۔ پہلی شکل میں افعال اور اسمار کا اختتام عام طور سے (آ) پر ہوتا ہے۔ اور دوسری شکل میں (اُو) پر۔ کھڑی بولی اور ہریانی میں عام طور سے یہی شکل ملتی ہے۔ جو گریرسن اور شیرانی کے خیال میں، پنجابی سے لی گئی ہے۔ (اُو) والی شکل برج بھاشا، قنوجی اور بندیلی میں، پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے پنڈت چندر دھر شرما گلیری انہیں کھڑی بولی کے مقابلہ میں "پڑی بولیوں" کا نام دیتے ہیں۔ اُردو نے اپنے دورانِ ارتقا میں (اُو) کی شکل کو کبھی بھی اختیار نہیں کیا۔

مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے

(۱) (اُو) کو ترجیح دینے والی بولیاں (۱) برج بھاشا (۲) بندیلی (۳) قنوجی

(۲) (آ) کی شکل رکھنے والی بولیاں (۱) ہریانی (۲) کھڑی بولی۔

برج بھاشا:-

مغربی ہندی کی سب سے نمائندہ بولی، یا استعارہ میں، اس کی سب سے عزیز بیٹی برج بھاشا ہے۔ یہ کھڑی بولی کے مقابلہ میں، شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت کی سچی جانشین ہے۔ اس کا مرکز برج (متھرا) کا علاقہ ہے لیکن یہ جنوب میں آگرہ، بھرت پور، دھول پور، کرولی، ریاست گوالیار اور جے پور کے مشرقی اضلاع تک پھیلی ہوئی ہے۔ شمال میں یہ گوڑگانوں ضلع کے مشرقی حصص تک رائج ہے۔ اس لئے اس کا شمار بھی نواح دہلی کی بولیوں میں ہو سکتا ہے۔

شمال مشرق کی جانب یہ بلند شہر، علی گڑھ، ایٹہ، مین پوری، بدایوں اور بریلی کے اضلاع سے ہوتی ہوئی نینی تال کے ترائی پرگنوں تک رائج ہے۔ متھرا کی برج معیاری مانی جاتی ہے۔ دوسرے اضلاع کی برج بھاشا میں مقامی اختلافات پائے جاتے ہیں، بلند شہر کے ضلع میں، یہ کھڑی بولی (ہندوستانی) سے گھُل مل جاتی ہے۔ جے پور میں یہ راجستھانی کے اثرات قبول کرلیتی ہے۔ شمال میں گوڑ گاؤں کے ضلع میں اس پر میواتی کا اثر دکھائی دیتا ہے۔ برج بھاشا کے مشرقی اضلاع کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بعض حروف صحیح ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے ہیں۔ مثلاً مخرج کا کچھو۔ مرتا ہے کا مت ہے۔ ٹھاکر صاحب کا ٹھکسا۔ نوکرانی کا نوکنی۔[۱]

برج بھاشا کا مرکز جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے متھرا ہے۔ متھرا ہندو تہذیب و تمدن کا مرکز ہونے کے علاوہ سنسکرت زبان کا گہوارہ رہا ہے۔ اس لئے برج بھاشا بھی سنسکرت کی طرح کٹھنگی لئے ہوتے ہے۔ اس کی بہترین مثال یہ ہے کہ اس میں اسمائے غیر جنس کو برقرار رکھا گیا ہے شمالی ہند کی دیگر بولیوں میں یہ اب بالکل متروک ہیں۔ اس کے تاریخی اور لسانی ارتقا پر روشنی اگلے باب میں ڈالی گئی ہے۔

بندیلی یا بندیل کھنڈی

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے بندیلی بندھیل کھنڈ میں بولی جاتی ہے اور اس کے بولنے والے بندیلے کہلاتے ہیں جغرافیائی تقسیم کے اعتبار سے بندھیل کھنڈ میں باندا، ہمیر پور جالون اور جھانسی کے اضلاع اور سنٹرل انڈیا کی اکثر ریاستیں بھی شامل ہیں۔ لیکن

---

[۱] لسانیاتی جائزۂ ہند: گریرسن: حصۂ اوّل جلد نہم ص ۷۱

بندیلی زبان کا علاقہ اس سے زیادہ وسیع ہے اور شمال میں یہ آگرہ، مین پوری اور ایٹہ کے ضلعوں تک بولی جاتی ہے۔ اس کے مشرق میں، پوربی ہندی کی بگھیلی بولی ہے۔ شمال اور شمال مغرب میں، یہ بولیوں یعنی قنوجی اور برج بھاشا سے گھری ہوئی ہے۔ اس کے جنوب مغرب میں راجستھانی کی بولیاں رائج ہیں۔ جنوب میں، اس کے حدود مرہٹی سے ملتے ہیں، بجز جنوب کے یہ ہر سمت میں، ہم سایہ بولیوں سے گھُل کر ل کر درمیانی بولیاں بنا دیتی ہے۔ بندیلی بولی میں غیر معمولی یکسانیت ملتی ہے۔ اس میں ادب کا بھی نہایت وقیع سرمایہ ملتا ہے۔ آلہا اودل کے قصّوں سے متعلق جو گیت آج دیہاتی ہندوستان کی رگوں میں خون کی رفتار تیز کر دیتے ہیں اسی بولی میں پہلے پہل لکھے گئے تھے۔ ان کے علاوہ ہندی ادب کے نورتن شاعر اور تنقید نگار کیشو داس اور پدماکر کا بھی تعلّق اسی بولی سے ہے۔

بندیلی میں، تلفّظ کی بعض اپنی خصوصیات ہیں۔ اس میں حروف (اِے) اور (اُو) چھوٹے ہو کر (اِ) اور (اُ) بن جاتے ہیں، مثلاً بیٹی سے بٹیا (بیٹیا نہیں)۔ اور گھوڑے سے گھردا (گھوروا نہیں)، جو کہ مشرقی زبانوں کی نمایاں خصوصیت ہے۔ دوسرے حروفِ علّت (آئی) عموماً (اے) میں، اور (اَو) عموماً (اُو) میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اور یہی تلفظ عام ہیں، مثلاً (کیوں) کے بجائے (کے ہوں)۔ (اور) کی بجائے (اُور) بھوپالی اُردو میں، یہ تلفّظ عام طور سے ملتا ہے۔ بیٹھنا۔ کینا۔ تیرنا۔ ہے۔ پیسہ۔ کیسا میں۔ روزمرّہ کے استعمال میں آتے ہیں۔

حروفِ صحیح میں برج کی طرح (ڑ) عموماً (ر) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پر د دَور گے۔ گھردا لیکن تلفظ کی سب سے نمایاں خصوصیّت یہ ہے کہ (ہ) ہمیشہ گرا دی

جاتی ہے۔ مثلاً گئی بجائے کہی کے، او بجائے آہو۔ بھوپالی اردو میں تلفظ کی یہ جھلک برابر ملتی ہے۔ ایک لفظ جو اس علاقہ میں ہر جگہ مستعمل ہے بہت کی بجائے بہوت ہے۔ قدیم دکنی میں یہ 'بہوت' ہمیشہ اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ بندیلی میں، بیٹیا۔ گھروا۔ بلی وا۔ اور چڑی وا قسم کے الفاظ کثرت سے ملتے ہیں جو اردو میں بھی اکثر استعمال کئے جاتے ہیں۔ مؤنث جہاں ہندوستانی میں (ن) لگا کر بناتے ہیں، بندیلی میں (نی) لگا کر۔ جیسے تیلی سے تیلنی (ہندوستانی تیلن) بھوپالی اردو میں یہ اثر بھی پایا جاتا ہے۔

قنوجی

مغربی ہندی کی اس بولی کا نام شہر قنوج کے نام پر ہے جو ضلع فرخ آباد میں ہے۔ قنوج کا شمار ہندوستان کے قدیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ سنسکرت کے پرانے ادب حتیٰ کہ رامائن تک میں اس کا ذکر ملتا ہے۔ ۸۰۰ء کے وسط میں یہ راٹھور راجپوتوں کے قبضہ میں آگیا۔ ۱۱۹۳ء میں اس خاندان کے آخری راجہ جے چند کی سلطنت مسلمانوں کے ہاتھوں تباہ ہوتی ہے۔ اس عہد کے ادب کے نمونے ابھی تک نہیں ملے ہیں، اس لئے قدیم قنوجی کی اہمیت کا پورا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

آجکل قنوجی اپنی خالص شکل میں، ایٹہ، فرخ آباد اور شاہجہاں پور کے اضلاع میں بولی جاتی ہے۔ یہ کان پور اور ہردوئی تک پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن کان پور میں یہ بندیلی بولی سے اور ہردوئی میں اودھی سے متاثر نظر آتی ہے۔ شاہجہاں پور کے شمال میں یہ پیلی بھیت تک بولی جاتی ہے۔ جہاں یہ برج بھاشا سے گھل مل جاتی ہے۔ اس کے مغرب اور شمال مغرب میں برج بھاشا اور جنوب میں بندیلی ہے۔ مشرق اور شمال مشرق میں یہ پوربی ہندی کی اودھی بولی سے گھری ہوئی ہے۔ اس کا رقبہ چونکہ محدود ہے اس لئے اس کی قسمیں نہیں ملتیں۔

البتہ کان پور اور ہردوئی کے اضلاع میں یہ ملواں شکل میں بولی جاتی ہے۔ کان پور میں جو لفظ حروفِ صحیح پر ختم ہوتا ہے اس کے آخر میں عموماً (ی) کا استعمال کر دیتے ہیں۔ فارسی، عربی الفاظ تک اس قسم کی تبدیلیوں سے نہیں بچتے۔ مثلاً بعدی (بعد) دوری (دور)۔

ادبی حیثیت سے یہ برج کی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے۔ اس کی اور برج بھاشا کی قواعد میں فرق بھی اتنا کم ہے کہ گریرسن کو اُسے علیحدہ بولی کی حیثیت دینے میں پس و پیش ہے۔ اس کی قواعد کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں برج بھاشا کے برخلاف (اَو) کی بجائے (اُو) پر ختم ہوتا ہے لیکن یہ (اُو) برج بھاشا کی بعض بولیوں میں بھی ملتا ہے۔ برج اور قنوجی دونوں میں حروفِ صحیح پر ختم ہونے والے الفاظ کے آخر میں (اَو) بڑھا دیا جاتا ہے۔ جیسے ہندوستانی گھر، قنوجی گھرا اور گھروا۔ دوسری ہمسایہ بولیوں کی طرح قنوجی میں بھی حروفِ علت کے درمیان کی (ہ) گر جاتی ہے۔ جیسے کہی ہو گی بجائے کئی اَو۔

ہریانی۔ بانگرو یا جاٹو

دہلی کے شمال مغربی اضلاع کرنال۔ رہتک۔ حصار وغیرہ کی بولی اِن تینوں ناموں سے پکاری جاتی ہے لیکن اس کا ہریانی نام زیادہ موزوں ہے۔ ہریانہ مسلمانی عہد سے بھی قبل کا نام ہے[1]۔ دہلی میں، یہ زبان جاٹو کے نام سے مشہور ہے۔ کیونکہ آس پاس کے علاقہ میں جاٹوں کی آبادی کثرت سے ہے۔ جمنا کے شمال مغربی کنارے پر اس کا اتصال مغربی ہندی کی ایک دوسری بولی، کھڑی بولی (گریرسن کی ہندوستانی) سے ہو جاتا ہے۔ گریرسن موجودہ ہریانی کو کھڑی بولی (ہندوستانی) ہی کی ایک شکل مانتا ہے۔ جس میں راجھانی

---

[1] ہریانی زبان میں تالیفات: محمود شیرانی، اورینٹل کالج میگزین، ۱۹۳۶ء جلد ہفتم۔

اور پنجابی بولیوں کی آمیزش پائی جاتی ہے[۱]۔ حالانکہ آگے چلکر پنجابی کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ پنجابی ایک مخلوط زبان ہے۔ جو قدیم ہندآریائی اور ودآیہ کی زبان کے اختلاط سے قدیم زمانہ میں بنی ہوگی۔ ان بیانات کے تضاد پر تفصیلی تنقید کسی اگلے باب میں کی جائے گی۔ دراصل گریرسن کے پیشِ نظر شمالی ہند کی اُردو کے قدیم نمونے نہ تھے۔ اِس لئے وہ ہریانی کی قدامت کے متعلق یہ صحیح نتائج اخذ نہ کر سکا۔

ہریانہ میں نومسلموں کی آبادی قدیم زمانہ سے پائی جاتی ہے۔ بلکہ سلطنتِ مغلیہ کے عہد تک تو یہاں ان کی کثرت تھی۔ سلاطین دہلی کے لشکروں میں بھرتی عام طور سے اِسی علاقہ کے جنگجو قبائل میں سے کی جاتی تھی۔ اس علاقہ کے کئی قصبات ہانسی، نارنول، جھجر وغیرہ کو سیاسی اعتبار سے مختلف زمانوں میں اہمیت حاصل رہی ہے[۲]۔ دہلی کے سیاسی انقلابات کا سب سے گہرا اثر بھی اسی علاقہ پر پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس علاقہ کی زبان میں کافی اُلٹ پھیر ہوتے رہے یہی وجہ ہے کہ اگر بعض اوقات کھڑی بولی کے افعال استعمال کئے جاتے ہیں تو کبھی کبھی پنجابی کے بھی۔ کرتا اور کہتا کے ساتھ ساتھ پنجابی کردا۔ اور کہندا بھی مستعمل ہیں۔ کھڑی بولی کا دہ جاوے ہے بھی سُنائی دیتا ہے۔ اور وہ جا سے بھی جنوب سے ہریانی پر برج بھاشا اور راجستھانی کی بولی میواتی بھی اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ شہر دہلی اتفاق سے ان تمام بولیوں کے سنگم پر واقع ہوا ہے۔ اِس لئے زبان کا معیار عرصے تک متعین نہیں ہو سکا۔ البتہ میر عبدالواسع ہانسوی کی غرائب اللغات[۳] ہندی کی تصنیف کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہانسی کے نواح کی ہریانی بولی معیاری مانی جانے لگی تھی جو جمنا پار کی میرٹھ ضلع کی کھڑی بولی

---

[۱] لسانیاتی جائزۂ ہند: گریرسن: حصہ اوّل جلد نہم صہ ۲۵۲

[۲] لسانیاتی جائزۂ ہند: گریرسن: حصہ اوّل جلد نہم صہ ۲۱۴

[۳] قلمی نسخہ لٹن لائبریری۔

(ہندوستانی) سے بہت زیادہ مماثلت رکھتی تھی۔لیکن خان آرزو تصحیح غرائب اللغات ہندی میں میر عبدالواسع سے اختلاف کرتے ہوئے ہریانی کی بجائے سند ہمیشہ برج بھاشا (گوالیری) سے لیتے ہیں زبان اہلِ اُردو"۔ یا "زبان اُردوئے شاہی" یا "بزبان اُردو" (اقتباسات خان آرزو کے ہیں) کو بھی وہ بہت زیادہ معیاری نہیں مانتے۔

کھڑی بولی یا ہندوستانی

پچھلے صفحات میں شمالی ہندوستان کی آریائی زبانوں کی سلسلہ وار تاریخ بیان کرتے ہوئے ہم بتاتے آئے ہیں کہ کس طرح ۱۰۰۰ء کے لگ بھگ اَپ بھرنش ہی کے اندر جدید آریائی زبانوں کے روپ جھلکنے لگے تھے۔ اس عہد میں شورسین دیس (متھرا کے اِرد گرد کا علاقہ) کی اَپ بھرنش (شورسینی اَپ بھرنش) کو ادبی حیثیت سے بہت فروغ تھا جس کا ڈنکا بنگال سے پنجاب تک بج رہا تھا۔ چنانچہ قدیم بنگالی ادب تک میں اس کی کافی جھلک ملتی ہے۔ اسی شورسینی اَپ بھرنش نے مغربی ہندی کو جنم دیا۔ جو ۱۰۰۰ء کے قریب ایک مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ جب کوئی زبان کسی وسیع علاقے میں بولی جاتی ہے تو اس میں یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ جزوی اختلافات کے ساتھ کئی بولیوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ مغربی ہندی بھی کم سے کم چار اور زیادہ سے زیادہ پانچ ایسی ہی بولیوں میں تقسیم ہو گئی تھی (۱) بندیلی (۲) ہریانی یا بانگڑو (۳) برج بھاشا (جس میں قنوجی بھی شامل ہے)۔ اور (۴) کھڑی بولی یا جسے گریرسن ہندوستانی کا جدید نام دیتا ہے۔

مغربی ہندی کی وہ بولی جو مغربی روہیلکھنڈ، دوآبہ کے شمالی حصّے اور پنجاب کے ضلع انبالہ میں بولی جاتی ہے۔ گریرسن اُسے ہندوستانی کہہ کر پکارتا ہے۔

اس میں اور ادبی ہندوستانی (اُردو) کی گرامر میں ماں بیٹی کا تعلق ہونے کے باوجود بیرونی اثرات کی وجہ سے بعض اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عام طور سے بولی ہندستانی میں ایک ہی مفہوم کے لئے کئی کئی محاورے پائے جاتے ہیں جن میں سے ایک کو ادبی سند مل گئی اور دوسرا متروک و مردود سمجھا جانے لگا۔ قطع نظر ادبی ہندوستانی کے، اس بولی ہندستانی کے اندر بھی برج بھاشا اور دیگر بولیوں کی طرح بہت سے فارسی، عربی الفاظ اس طرح گھُل مل گئے کہ وہ اس کا جزو بدن معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً مظفر نگر کے دیہات کا باشندہ ماں کے عام فہم لفظ کی بجائے عربی کے لفظ "والدہ" کو بگاڑ کر "مالدہ" کہے گا۔ اسی طرح محافظت کو مہوجت۔ انتقال کو محض کال، اور مطلب کو مطبل وغیرہ۔[1]

ہندستانی بولی کے حدود اربعہ کی تفصیل یہ ہے۔ ریاست رام پور، اور گنگا کے پورب میں، مراد آباد اور بجنور کے اضلاع اور مغربی روہیلکھنڈ۔ ان مقامات کی بولی ادبی ہندوستانی سے قریب ترین ہے۔ اس کی وجہ یقیناً یہ ہے کہ ان مقامات میں مسلمانوں کی تعداد کثیر ہے۔ اور ان کے تمدن کا گہرا اثر رہا ہے۔ گنگا کے دوسری طرف یہ میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور کے اضلاع اور دہرہ دون کے میدانی علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ ضلع دہرہ دون کے پہاڑی علاقوں میں پہاڑی زبان رائج ہے۔ دوآبہ کے بالائی حصے کی بولی بھی ادبی ہندستانی (اُردو) سے بہت ملتی جلتی ہے لیکن اس قدر نہیں جتنی مغربی روہیلکھنڈ وغیرہ کے اضلاع کی۔ یہاں کی زبان میں بہت سی ایسی شکلیں رائج ہیں جو مراد آباد، بجنور وغیرہ کے اضلاع میں متروک سمجھی جاتی ہیں۔ جمنا پار کر کے پنجاب میں داخل ہوئے تو جنوب سے شمال کی طرف جو اضلاع ملتے ہیں۔ حسب ذیل ہیں

---

[1] لسانیاتی جائزۂ ہند: جلد نہم حصہ اوّل: ہندوستانی۔

دہلی، کرنال، انبالہ۔ دہلی (قطع نظر شہر دہلی) اور کرنال کے اضلاع کی زبان ہندوستانی نہیں ہے۔ یہاں مغربی ہندی کی ایک دوسری بولی جس کا نام بانگڑو دیا جاتو ہے بولی جاتی ہے۔ اس پر راجستھانی اور پنجابی کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ ضلع انبالہ تک پہونچتے پہونچتے راجستھانی کے اثرات زائل ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ ضلع انبالہ کی مشرقی اور کالیا اور پٹیالہ کی بعض تحصیلوں کی زبان ہندوستانی ہی ہے۔ جو پنجابی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہے۔ مغربی انبالہ کی زبان تو بالکل ہی پنجابی ہے۔ اس علاقہ میں ہندوستانی اور پنجابی کے درمیان دریائے گھگر کو خطِ فاصل قرار دیا جاسکتا ہے۔

یہ ظاہر ہوچکا ہے کہ کھڑی بولی یا ہندوستانی مغربی ہندی کے شمال مغربی علاقہ کی بولی ہے۔ اس کے مغرب میں پنجابی یا دِلّی اور کرنال کی آدھی راجستھانی ملی ہوئی بانگڑو دیا جاتو زبان ہے۔ اس کے شمال میں پہاڑی بولیاں ہیں جن کا راجستھانی سے گہرا رشتہ ہے۔ جنوب اور مشرق میں یہ برج بھاشا سے گھری ہوئی ہے۔ چنانچہ گریرسن نے اُسے برج بھاشا کا ایسا روپ مانا ہے۔ جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتا چلا گیا ہے[1]۔ یہاں بظاہر گریرسن کی تحقیقات میں تضاد نظر آتا ہے۔ اس سے قبل وہ تقسیم زبان کے سلسلہ میں پنجابی کو بیرونی اور اندرونی زبانوں (لہندا اور مغربی ہندی) کی آمیزش کا نتیجہ بتاتا ہے۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کسی زمانے میں مغربی ہندی کی شمال مغربی شاخ (کھڑی بولی اور ہریانی کی کسی قدیم شکل نے) لہندا کو لاہور تک پیچھے ڈھکیل دیا تھا چنانچہ اندرونی زبانوں کے اثرات جوں جوں ہم مغرب کی طرف جاتے ہیں۔ ہلکے ہوتے چلے جاتے ہیں! اس درمیانی زبان یعنی پنجابی نے مسلمانوں کی فتوحات کے وقت

---

[1] لسانیاتی جائزۂ ہند: جلد نہم حصہ اوّل: ہندوستانی۔

مدھ دیش کی بولیوں پر ان کی فاتح افواج کے ساتھ چڑھائی کی۔ اور مغربی ہندی کی شمال مغربی بولیوں (ہریانی اور کھڑی) پر اثر انداز ہوئی۔ اس طرح مغربی ہندی کی وہی پرانی خصوصیات جو کبھی لہندا کی سرزمین میں کھپ گئی تھیں مغربی ہندی کی ان بولیوں کو پھر واپس مل جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ پنجابی گرامر کا وہ حصہ جسے پروفیسر شیرانی پنجابی کا اپنا بتاتے ہیں (جس سے تفصیلی بحث آگے کی گئی ہے) وہ دراصل براہِ راست مغربی ہندی کی قدیم شکل (شورسینی اپ بھرنش) سے ماخوذ ہے۔

ادبی ہندوستانی (اردو) اور مغربی ہندوستانی میں بعض تلفظ کے بھی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ حروف صحیح میں مغربی ہندوستانی میں پنجابی، راجستھانی اور ہریانی کی طرح مخی (ن) اور (ل) کا استعمال آزادی سے پایا جاتا ہے۔ جو اردو کی طرح مغربی ہندی کی دیگر بولیوں، برج وغیرہ میں بھی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ جمع میں حالت مفعولی کا اختتام اردو کے برخلاف اکثر (اں) پر ہوتا ہے جیسے وناں، عورتاں وغیرہ۔ یہ شکل ہریانی، راجستھانی اور پنجابی میں عام ہے۔ دکنی کی بھی یہ خصوصیت ہے لیکن اردو اور برج بھاشا میں نہیں ملتی۔ افعال میں اسی طرح حالیہ میں مارتا ہوں کے ساتھ میں ماروں ہوں بھی ملتا ہے۔ میں ماروں ہوں، وہ مارے ہے۔ تو مارے ہے۔ یہ شکل راجستھانی اور ہریانی زبانوں میں بھی ملتی ہیں۔ دکنی اور قدیم اردو (میر و سودا بلکہ غالب اور ذوق تک) فعل کی یہ شکلیں مل جاتی ہیں۔ آج بھی بجنور مراد آباد وغیرہ کے اضلاع اور دہلی میں اسی طرح بولی جاتی ہے۔ لیکن جدید اردو نثر میں متروک ہو گئی ہیں گو شعر میں اُن کا رواج اب تک جائز مانا جاتا ہے۔

ہندوستانی کے بارے میں گریرسن اور لائل دونوں کی رائے یہی ہے۔ کہ بولی ہندوستانی کا ڈول اور اس کا کینڈا دیگر بولیوں کی بہ نسبت برج سے زیادہ قریب

ہے۔[1] بولی کے اعتبار سے اس کی اپنی علیحدہ حیثیت ہے۔ بعض نحوی خصوصیات کی وجہ سے قنوجی کی طرح اُسے ہم برج میں ضم نہیں کر سکتے۔ یہ قدیم زمانہ سے دلّی اور اُس کے آس پاس کی زبان ہے۔ قدیم سیاسی جغرافیہ میں یہ کرُدراج کی زبان تھی۔[2] اب چاہے اُسے دہلوی، کھڑی بولی یا ہندوستانی، کسی نام سے بھی یاد کیا جائے۔ اس کا علاقہ اور اُس کی قدامت متعین کی جا سکتی ہے۔ اگلے باب میں قدیم عہد سے اُس کے رُوپ کو اَپ بھرنش کی ادبیات میں پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے۔

---

[1] لسانیاتی جائزۂ ہند: جلد نہم حصہ اوّل اور انسائیکلوپیڈیا بریٹانیکا۔

[2] سرسوتی: جون ۴۴ء: ہندی بھاشا کا پردیش: چندر بلی پانڈے۔

تیسرا باب

ہندوستانی کا عہد بہ عہد کا ارتقا

اُردو (کھڑی بولی) کی جنم بھومی کی اہمیّت

پچھلے صفحات میں ہند آریائی زبان کے لسانی تسلسل کی نشان دہی سنہ ۱۱۰۰ء تک کی گئی ہے۔ اب ہم اگلے چھ سو سال (سنہ ۱۱۰۰ء تا سنہ ۱۷۰۰ء) کے لسانی ارتقا کا جائزہ لیں گے۔ اس عرصہ میں زبان نے جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں اس کا کھلا ہوا ثبوت اُردو کا قدیم و جدید ادب ہے۔ ہندوستان کی زبانوں میں جو اہمیّت آج اُردو کو حاصل ہے۔ وہ محض اتفاقی نہیں۔ بلکہ یہ سینکڑوں سال کی تمدّنی اور سیاسی تحریکات کا لازمی نتیجہ ہے۔ آریوں کی آمد سے لے کر مسلمانوں کی فتوحات تک ہندوستان میں جس علاقے کی زبان کا راج رہا۔ وہ مدھ دیش (مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب) کی کسی نہ کسی بولی پر مبنی تھی۔ عہدِ قدیم میں ویدک زبان اِسی علاقے میں پورے طور سے نکھرتی ہے۔ رِگ وید کے آخری اشلوک جمنا کی وادی میں تصنیف کئے گئے تھے۔ کلاسیکل سنسکرت کی بُنیاد متھرا کے آس پاس کی کسی قدیم آریہ بولی پر رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد سنسکرت کو تقریباً وہی مرتبہ حاصل رہا جو آج اُردو کو حاصل ہے۔ ادبی زبان کی حیثیت سے اُسی زمانہ میں پالی کو فروغ حاصل ہوا جس کے متعلق اَب یہ مسلّمہ طور سے کہا جا سکتا

ہے کہ اس کا سرزمینِ بہار سے کوئی تعلق نہ تھا[1]۔ اس کا ڈھانچہ مدھ دیش ہی کی کسی قدیم زبان پر تیار ہوا تھا۔ مشرقی ہندوستان میں پالی ادبی حیثیت سے البتہ عرصہ تک رائج رہی۔ بلکہ بعد کو بدھ مت کے ساتھ ساتھ یہ سیلون، برما اور سیام تک مقدس زبان کی حیثیت سے پھیل گئی تھی۔ صرف کچھ عرصے کے لئے خاندان موریہ کے عہد میں مشرقی ہندوستان کی زبان کے بھاگ پھرے تھے۔ اشوک کے عہد میں جیسا کہ مذکور ہو چکا ہے یہ ہندوستان کی معیاری زبان بن گئی تھی اور سرکاری سرپرستی میں اس کے بولنے اور سمجھنے والوں کا دائرہ پنجاب تک وسیع ہو گیا تھا۔ اشوک کے کتبوں کی زبان اس کی آئینہ دار ہے۔ لیکن گنگا کا یہ اُلٹا بہاؤ محض عارضی تھا۔ عہدِ وسطیٰ میں ایک مرتبہ پھر مغربی یوپی کی شورسینی پراکرت (جس کا مرکز متھرا تھا) ہندوستان کی ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے پڑھے لکھے سماج میں سنسکرت کے بعد اگر کسی زبان کا سکہ بیٹھا ہوا تھا تو وہ یہی پراکرت تھی جس کی جھلک سنسکرت کے ناٹکوں تک میں ملتی ہے۔ خود مہاراشٹری پراکرت جدید تحقیق کے مطابق اسی کی ایک جدید اور ترقی یافتہ شکل تھی، جو عام طور سے سنگیت اور شاعری میں استعمال کی جاتی تھی۔ عہد اَپ بھرنش میں بھی اسی علاقے کی اَپ بھرنش کو عروج حاصل رہا۔ جو پنجاب سے لے کر بنگال تک واحد ادبی زبان کے طور پر رائج تھی۔ سنہ ۱۱۰۰ء میں جب ترک پنجاب کے میدانوں میں داخل ہوتے ہیں تو اس وقت شورسینی اَپ بھرنش اپنے شباب پر تھی۔ سنسکرت اور پراکرت کے ساتھ ساتھ راجپوتوں کے درباروں میں اس نے بھی ایک خاص مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ ہندوستان کی جدید بولیوں کے بیج اسی کے اندر سے پھوٹنا شروع

---

[1] انڈو ایرین اور ہندی : چٹرجی : صفحہ ۱۶۵

ہو گئے تھے ۔ ان کی طرف اشارہ کرنا اور ان کو پہچاننا اگلے باب کا یہی خاص موضوع ہے ۔

راجپوتوں کے عہد سے ابتدائی سلاطینِ دہلی کے عہد تک

(۸۰۰ء تا ۱۲۰۰ء)

ہندی کے مشہور عالم پنڈت چندر دھر شرما گلیری نے ایک جگہ لکھا ہے۔ "بدیسی مسلمانوں نے آگرہ، دلّی، سہارن پور، میرٹھ کی 'پڑی' بولی کو 'کھڑی' بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے مطابق بنا لیا[1]۔ اس طرح کھڑی بولی یا اُردو کا آغاز ہوا۔ کچھ اسی قسم کا لسانیاتی مغالطہ پروفیسر شیرانی کو ہوا جنہوں نے کھڑی بولی اور ہریانی دونوں کی قدامت سے انکار کیا ہے ۔ اس باب میں کھڑی بولی (حروف، افعال اور لاحقوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے جس کی موٹی پہچان یہ ہے کہ ہندوستانی "کا۔ میں۔ پر۔ سے۔ اِس۔ اُس۔ جس۔ کس۔ اور نا۔ تا۔ آ۔ گا" والی بولی ہے[2]) کی قدامت کو ہم قدیم ادب کے اِن نمونوں سے ثابت کریں گے جو عہد اپ بھرنش سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور جن میں مغربی ہندی اور اُس کی بولیوں (کھڑی ۔ برج وغیرہ) کی قدیم شکلیں صاف نظر آتی ہیں ۔

عہد اپ بھرنش کی تصنیفات کا لسانیاتی جائزہ :-

جس طرح پراکرتوں کی جگہ عوام کی بولی اپ بھرنش نے لے لی اسی طرح جب

---

[1] ناگری پرچارنی پتر کا سمت ۱۹۸۶ صفحہ ۱۲۲ [(برج بھاشا) میرو بیٹو آئیو۔ (ہندوستانی) میرا بیٹا آیا]

[2] نا = علامت مصدر، تا = علامت مضارع، آ = علامت ماضی

گا = علامت مستقبل

اَپ بھرنش بھی ادبی زبان بن کر محدود ہوگئی تو ہندوستان کی موجودہ بولیوں نے اس کی گدی چھیننا شروع کی لیکن ابھی تک یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ہندوستان کی نئی زبانوں کا آغاز کس سنہ سے ہوتا ہے۔ اور اَپ بھرنش کب ختم ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اَپ بھرنش کے باب میں دِکھا چکے ہیں اس میں تصنیفات کا سلسلہ چودھویں بلکہ پندرہویں صدی عیسوی سے ملتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ جدید بولیاں پوری طرح اُبھر چکی تھیں۔ بقول گلیری "پُرانی اَپ بھرنش سنسکرت اور پراکرت سے ملتی ہے۔ اور بعد کی قدیم ہندوستانی سے"۔ "جس طرح اس زمانے میں لفظ "گاتھا" سے مُراد پراکرت ہوتی تھی۔ اسی طرح "دوہا" سے اَپ بھرنش ملی ہوئی رائج الوقت زبان کا مفہوم لیا جاتا تھا؛ جس کی ادبیات کے نمونے ۸۰۰ء سے ملتے ہیں۔ اس عہد کے زبان کا مطالعہ حسب ذیل تصانیف پر مبنی ہے۔

(۱) وجے پال راسو (۲) ہمیر راسو

(۳) کیرتی لتا (۴) کیرتی پتاکا

قدیم ہندوستانی کے مطالعہ کے لئے ذیل کی کتب مستند سمجھی جاتی ہیں:۔*

(۱) کھومان راسو (۲) بیسل دیو راسو (۳) پرتھوی راج راسو

---

* نوٹ: بشر بندھوؤں نے اپنی معرکۃ الآرا تصنیف میں حسب ذیل فہرست کا اضافہ کیا ہے۔
(۱) بھگوت گیتا (مترجمہ) (۲) وردھ نوکار (۳) ورت مال (۴) سنت سار (۵) بہت رلی (۶) انبیہ یوگ (۷) چمبو سوامی راسا (۸) ریوت گری راسا (۹) نیمی ناتھ چوپئی (۱۰) اُپدیس مالا (اپدیش مالا)۔ ان میں بھگوت گیتا کی زبان سے تو صاف ظاہر ہے کہ وہ بعد کی تصنیف ہے۔
مثلاً سمیروں گرو گوبند کے پاؤں اگم اپار ہے جا کر ناؤں

(۴) جے چند پرکاش (۵) جے مینمک جس چندریکا (۶) پرمال راسو (آلھا کی اصل شکل) (۷) ودیاپتی پداولی (۸) امیر خسرو کی ہندی شاعری کو ابھی تک خاص اہمیت دی جاتی ہے لیکن ہمارے خیال میں وہ اس کی مستحق نہیں۔

مذکورہ بالا کتب کے علاوہ ادب کا بہت بڑا ذخیرہ ان بدھ سدھوں اور گورکھ پنتھی جوگیوں سے منسوب ہے جو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں میں اپنے مذہبی گورکھ دھندے کی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ لسانیاتی نقطۂ نظر سے یہ بہت زیادہ مستند نہیں تاہم ان کی پچ رنگی زبان کا جائزہ اس عہد کی بہت سی لسانی گتھیوں کا حل پیش کرتا ہے۔

اس زمانہ میں بدھ دھرم اپنی بگڑی ہوئی شکل میں مشرقی ہندوستان میں پھیلا ہوا تھا۔ بہار میں نالندا اور وکرم شلا نام کی مشہور درسگاہیں بدھ سدھوں (راہبوں) کے اڈے تھے۔ بختیار خلجی نے جب ان مقامات کو اجاڑا تو یہ تتر بتر ہو کر ادھر ادھر پھیل گئے۔ ان بدھ سدھوں نے عوام کو اپنے پنجوں میں رکھنے کے لیے سنسکرت کے علاوہ اپ بھرنش ملی ہوئی "دیش بھاشا" میں بھی دوہے لکھے ہیں۔ ان میں چوراسی (۸۴) سدھ مشہور ہیں جن میں سب سے پرانے "سرہ" ہیں جو ۶۳۳ء کے آس پاس گذرے ہیں[1]:

نمونہ:- جہی من پون نہ سنچرئی، روی سسی ناہیں پویس
تہی بٹ چیت بسام کرد، سرہے کرہی آ اودیس

---

[1] مشر بندھو ونود: حصہ اول ص ۷۲-۷۸

گھور اندھارے چند منی جی، اجوّا کرئی
پرم مہاسودا کیھو کنے دُری اا شیش ہرئی

مذکورہ بالا اقتباس میں (نہ)۔ (ناہیں) (دکھ ہی ا)۔ (اندھارے)۔ (اُجوّا)
(دُوری ا) مقابل غور ہیں۔ کہیا وغیرہ افعال کا خاتمہ (اَ) پر ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے
یہ صرف پنجابی زبان کی خصوصیت نہیں۔ جیسا کہ پروفیسر شیرانی نے زور دیا ہے۔ بلکہ
اَپ بھرنش اور اُس زمانہ کی مروّجہ زبانوں میں "کہیا" اور "کہیو" ماضی کی دو نوں
شکلیں رائج تھیں۔ برج بھاشا نے "کہیو" اپنایا اور کھڑی بولی اور ہریانی (ا) والی
زبانیں بن گئیں۔

(ا) فعل کی شکل اس عہد کے ایک دوسرے سدّھ لوہی پا (۱۷۷۲ء کے لگ بھگ)
کے یہاں بھی ملتی ہے۔ ذیل کے دوہے میں (کوی ا) اور (پوچھیّا) کی ترکیبیں ہریانی
اور قدیم اُردو (دکنی) دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ جس کی تاویل شیرانی نے پنجابی سے
کی ہے۔ نمونہ یہ ہے۔

ڈٹ کری اُمہا سوہ پری مان
لوئی بھنی گرو پوچھیّا جان

اسی طرح برو پا سدھ (۸۴۲ء) کے یہاں دیکھیا، بھیا، ماریا، ماضی کی وہی
علامتیں ملتی ہیں۔ تانتی پا وغیرہ دیگر سدّھوں کے دوہوں میں زبان کا یہی رنگ ملتا ہے۔
چونکہ یہ سدّھ زیادہ تر ملک کے پوربی علاقوں میں اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے تھے۔ اس
لئے وہاں کی مقامی بولیوں سے متاثر ہونا ناگزیر تھا۔

ان کے برعکس گورکھ ناتھ پنتھی جوگی راجپوتانے اور پنجاب کے علاقوں میں

اپنی کرامات دکھاتے پھرتے تھے۔ گورکھ کی مذہبی کتابیں جو ۱۳۴۳ء کے آس پاس مرتب کی گئی ہیں، نظم اور نثر دونوں ملتی ہیں لیکن امتداد زمانہ سے ان کی زبان میں بہت کافی اُلٹ پھیر ہو گیا ہے۔ انکے بعض حصے ضرور قدیم معلوم ہوتے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ وہ گورکھ ناتھ ہی سے یادگار ہوں۔

سوامی تم ہی گُرد گوسائیں
اٗھے جے سکھ سبد ایک بوجھیبا
نرار مبھے چیلا کون بِدھی رہے
ست گرو ہوئی سا پوچھیا کہے
اب دھو رہیا ہاتے بائے رُوپ ورکھ کی چھایا
تجیبا کام کرودھ ماہ سنسار کی مایا[۱]

بُدھ سدھوں اور ناتھ پنتھی جوگیوں کے جو نمونے دیئے گئے ہیں ان کی زبان کو پڑھئے تو معلوم ہو گا کہ وہ "دیش بھاشا" ملی ہوئی اَپ بھرنش یعنی پرانی ہندوستانی ہے۔ اُنہوں نے اپنے دوہوں میں عام طور سے وہی زبان استعمال کی ہے جو اس وقت عام طور سے گجرات، راجپوتانے اور برج (متھرا) سے لے کر بہار تک کے لکھے پڑھے لوگوں کی زبان خیال کی جاتی تھی لیکن مگدھی کے علاقے میں رہنے کی وجہ سے سدھوں کی زبان میں پوربی کے اثرات بھی دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً دھبَی لے۔ بوڑیِ لِ۔ "ل" مشرقی زبانوں کی علامت ماضی ہے)، لیکن پرانی ہندوستانی کا یہ ڈھانچہ جو ہمیں

---

[۱] ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس : پنڈت ہری اودھ صفحہ ۱۹۲

سدھوں اور ناتھ پنتھیوں کے دوہوں میں ملتا ہے شورسینی سے نکلی ہوئی برج بھاشا اور کھڑی بولی کا تھا جن کی جھلک ذیل کے الفاظ میں مل جائے گی ۔

جو ۔ سو ۔ ماریا ۔ پیٹھ ۔ جا ۔ جاب (جب تک) تاب (تب تک) بھٹیا کوئی ۔ وغیرہ ۔

ان الفاظ کا تعلق قدیم ماگدھی سے نہیں بلکہ شورسینی سے جنم لینے والی اپبھرنش (جسے گریرسن نے مغربی ہندی کا نام دیا ہے) سے ہے۔ "سدھپا کن ھپا" کے اشعار کی زبان کا جائزہ لیجئے تو یہی بات واضح ہوتی ہے لیکن گیتوں کی زبان میں پرانی پوربی بولیوں کی ملاوٹ زیادہ دکھائی دیتی ہے۔ اس قسم کا فرق بعد کو ہمیں کبیر داس کی "ساکھی" اور "رمینی" (گیتوں کا مجموعہ) کی زبان میں بھی ملتا ہے۔ ساکھی (اپدیشوں کا مجموعہ) کی زبان راجستھانی اور کھڑی بولی ملی ہوئی "سدھکڑی" زبان ہے لیکن "رمینی" کے اشعار میں اس عہد کے شعر و ادب کی زبان برج بھاشا اور کہیں کہیں پوربی کی آمیزش بھی دکھائی دیتی ہے ۔

۹۳۳ء میں دیوسین نام کا ایک جین مُصنّف ہوا ہے۔ وہ "شیراوکا چار" کا مصنف ہے۔ اُس کے دوہوں کی زبان کا جائزہ لیجئے تو یہی لسانی میلانات ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ذیل کے الفاظ قابلِ ذکر ہیں۔

جو ۔ جن ۔ بھاشیو (کہا) سو ۔ کہو ۔ کری ۔ پاوئی ۔ پارو (پار)

لیکن اس عہد کی سب سے اہم تصنیف ہیم چندر (۱۰۸۸ء تا ۱۱۷۲ء) کی قواعد "ہیم چندر شبدانوشاسن" ہے۔ ہیم چندر گجرات کے مشہور جین عالم تھے۔ انھوں نے اپنی قواعد میں سنسکرت، پراکرت اور اپ بھرنش پر تفصیلی بحثیں کی ہیں۔ اپ بھرنش کے

نمونے اس زمانے کے مقبول عام دوہوں کی شکل میں نقل کئے ہیں۔ مثلاً ایک راجپوت عورت اپنی سہیلیوں سے کہتی ہے ؎

بھلا ہوا جو ماریا بہنی مہارا کنتُ
لجّے جم تو داسیا ہو جنے بھگا گھر دانتُ

(بھلا ہوا بہن! جو میرا کنت (پیارا۔ شوہر) مارا گیا۔ جو بھاگ آتا تو ہم عمر سہیلیوں میں مجھے لاج آتی)۔

ہیم چندر نے اور بھی بہت سے دوہے نقل کیے، جن کے لسانی جائزہ کی تفصیل ذیل میں دیجاتی ہے۔[1]

(۲) کسو (کسی)۔ دوتی (دونوں)۔ تِنا (تنکا)۔ سواں (سا)۔ گنائی (گئے)

(۳) جائی (جو)۔ اوائی (آئے)۔ گھرُو (گھر)۔ کا (کیا)۔ تجھو (تجھ۔ بمعنی تیرا) مو (منہ)۔ سو (وہ)۔ پیو (پیا)۔ ہوئی (ہوئے) نا (نہ)، مجھو (مجھ بمعنی میرا)۔

(۴) امھے (میرے)۔ تموا (تیرے)۔ بہوا (بہوت)۔ نہارنا (دیکھنا)۔ کتے (کتنے)۔ جنَ (آدمی جن)۔

(۵) گنُ۔ کون۔ موئینا (مرنا۔ موا قدیم اُردو کا)، باپّ (باپ)۔ بہئیں (زمین: دیکھی "قطب مشتری" میں ؎ نہ بہئیں پر دسے اور نہ آسمان میں)۔

(۶) دِنّ [2] (دن)۔ دینے (دئے)۔ گِنتے (گنتے)۔ انگلوں (انگلیاں)۔

---

[1] نمبر ۲ تا ۵: انڈو آرین اور ہندی: چٹرجی: ص ۱۶۵

[2] (نمبر ۶ تا ۹): ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس؛ پنڈت اجودھیا سنگھ ہری اودھ۔ ص ۱۱۸

(۷) مئی (میں نے)۔ کرد (کر)۔ بنکو (بانکا)۔ ماری (مارتی ہے)۔

(۸) اپری (اوپر۔ دکنی کا اُپر)۔ دھری (دھرتا ہے)۔ تی (تئے)

(۹) دیبو (دیکھا۔ دکنی کا دیسنا)۔ ادھا (آدھا)۔ مرئی (مارتا ہے)

اس عہد کی دوسری بڑی تصنیف جینی عالم میرو تنگ کی "پربندھ چنتامنی" ہے۔ اس میں پرانے راجاؤں کے تذکرے ہیں۔ قصّوں کے بیچ بیچ میں اَپ بھرنش کے اشعار بھی مل جاتے ہیں جو اس زمانہ میں زباں زد خلائق تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس میں سے کچھ دوہے راجہ بھوج کے چچا راجہ منج کے کہے ہوئے ہیں ایک دوہا ہے۔

بانہہ بچھوڑ دِی جاہی تو ہوں، ہوؤں تے دین کا دوس
ہیا ٹھیئے جی نیں دہی جانوں منج سروس

برج بھاشا کا اسی مفہوم کا دوہا زبان کے قدرے فرق کے ساتھ مشہور ہے :۔

بانہہ چھڑائے جات ہو جان کر نِبل موئے
ہردے میں سے جاؤگے تو مرد بدھوں گی توئے

(مجھے کمزور جان کر تم بانہہ چھڑا کر جا رہے ہو۔ دل میں سے چلے جاؤ تو تمہیں مرد جانوں)

اَپ بھرنش کے دوسرے نامور مصنّف اور شاعر سوتم پر بھ سوری، ودیادھر اور شارنگ دھر ہیں۔

سوری کی کتاب "کمار پال پرتی بودھ" کے دوہوں میں زبان کی یہ شکلیں نظر آتی ہیں۔

پیاؤں (پلاؤں)، کھیر (سنسکرت: کشیر۔ فارسی: شیر بمعنی دودھ) گنگا جل۔

کی (کیا) ہوئے (ہو جاتی ہے) ۔ ہتھو (ہاتھ)[1]

شارنگ دھر کے یہاں بھی چلیا (چلا)، جھوٹھے (جھوٹے)۔ میرے کہے ۔ بادل۔ چھائی (چھائے) توڑی (توڑ کر)۔ برج بھاشا کی قدیم شکلیں نظر آتی ہیں ۔ شارنگ دھر کے 'پدوں' سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ اس زمانے میں زبان کی دونوں شکلیں رائج تھیں ۔ کھڑی اور پڑی (کھڑی بولی اور برج بھاشا)۔ اس کے دوہوں میں "بادل چھائی پسری" بھی ہے اور "رے کنت میرے کہے" بھی ۔ "داگھنی کنو مکھ" بھی ہے ۔ اور "کالی یا کھنی کی دہائی" اور "گرو کے پائے" بھی[2] ۔ اپ بھرنش واحد متکلم کی علامت (اُو) بھی رائج تھی ۔ زمانۂ حال کے لئے بھی (اُو) ہی مستعمل تھا ۔ امر کے صیغہ میں (ای ۔ اُو ۔ ہو ۔ ہیا ۔ ہی) کی بجائے محض لفظ کا مادہ رہ گیا تھا ۔

شارنگ دھر ہی سے "ہمیر راسو" منسوب ہے ۔ جو ہندی ادبیات کے دیرگا تھا عہد سے تعلّق رکھتا ہے ۔ اس میں زبان نکھر جاتی ہے ۔

نمونہ :- (۱۳۱۴ء)

ڈھولا ماریا ڈھلّی مانہہ مُچھیو میچھ سریر[3]

(دلّی میں ڈھول بجایا گیا اور ملچھوں (مسلمانوں) کے سریر (جسم) بے ہوش ہو گئے)

اپ بھرنش کی سب سے بڑی خصوصیت (جو بعد کو نئی زبانوں نے بھی

---

[1] ناگری پرچارنی پتر کا سمت ۱۹۷۸ : ص ۱۵۱

[2] جن دوہوں سے یہ ٹکڑے لئے گئے ہیں اُن کے لئے دیکھئے' وہی ص ۲۳

[3] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص ۲۵ : رام چندر شکل ۔

اپنائی)، یہ تھی کہ اس میں سنسکرت کے تت سم (خالص) الفاظ کو مطلق دخل نہ تھا۔ چنانچہ اپکار (بھلائی)، نگر۔ وِدّیا۔ اور وچن جیسے عام فہم سنسکرت الفاظ بھی۔ اُدا۔ ہَرِ۔ وِجّا۔ اور بَیّن بن جاتے تھے۔ "پربندھ چنتامنی" کے مذکورہ بالا دوہے 'ہیئے اور ہردے کے فرق کو صاف ظاہر کر رہے ہیں۔ سنسکرت کا "ہردے" لفظ اپ بھرنش میں "ہیا" ہو جاتا ہے۔ لیکن جوں جوں شاعری کی زبان پراکرت اور اپ بھرنش کی روایات سے آزاد ہوتی گئی لوگوں کو سنسکرت کے 'تت سم' (خالص) الفاظ کے استعمال سے پرہیز نہ رہا۔ وِدّیاپتی کے یہاں یہ الفاظ کافی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ دکنی ادبیات تک میں خالص سنسکرت کے بے شمار الفاظ مل جاتے ہیں[1]۔ حالانکہ مسلمانوں کی آمد کی وجہ سے "سنسکرتیت" کے اس رجحان کو کافی نقصان پہونچا تھا۔

اپ بھرنش کی تصانیف کے بعد ہندی ادب کا وہ عہد آتا ہے جسے "ویرگاتھا" کہا جاتا ہے۔ یہ نام اس لئے دیا گیا ہے کہ اس عہد کے جو بھی ادبی نمونے ملتے ہیں، ان میں ہندو ویروں اور سورماؤں کے قصیدے گائے گئے ہیں۔ اس عہد کی طویل نظموں کو ہندی میں "راسو" کہا جاتا ہے۔ اس عہد کا سارا ادب اُن بھاٹوں اور درباری شاعروں کی دماغی پیداوار ہے جنہوں نے ہندو سورماؤں کو مسلمانوں کے مقابلہ کے لئے اُبھارا ہے اور اُن کے گُن گائے ہیں۔ یہ ادب عام طور سے دو قسم کی زبانوں

---

[1] مثلاً میگھ (بادل)۔ دوت (پیام بر)۔ داس (غلام)، چرن (پاؤں)۔ دِنکر (سورج)، سیس (سر)۔ پرگٹ (ظاہر)، رکت (خون)۔ روی (سورج)۔ اَدِھک (زیادہ)۔ انبر (آسمان) وغیرہ یہ تمام الفاظ "سب رس" (؟) "میں سے لئے گئے۔

میں ملتا ہے۔ ایک زبان کا ڈھانچہ تو بالکل "راجستھانی۔ گجراتی" ہوتا تھا جس میں پراکرت کے پُرانے الفاظ بھی گھلے ملے نظر آتے ہیں۔ اس کو "ڈِنگل" کہا گیا ہے۔ نئی آریائی زبانوں کے آغاز کے بہت بعد تک بھاٹ اور درباری شاعر اپنی علمیت کے زور پر اِسی روایتی اور مُردہ زبان میں شاعری کرتے رہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ عوام میں ایک سہل ادبی زبان بھی رواج پا چکی تھی۔ اس میں شاعری کرنے والے وہ لوگ تھے جو دربار کی بہ نسبت عوام سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اپنی ساخت کے اعتبار سے پُرانی برج بھاشا کہی جا سکتی ہے جس میں کبھی کبھی کھڑی بولی اور پنجابی کا پیوند بھی نظر آجاتا ہے۔ اُسے "پنگل" (جو اب ہندی عروض کے لئے مخصوص ہے) کا نام دیا گیا۔ اکثر شاعر ڈنگل اور پنگل دونوں میں شاعری کرتے تھے لیکن راجستھانی شاعر عام طور سے اپنی زبان کو قدامت کی سند دینے کے لئے جان بوجھ کر پراکرت اور اَپ بھرنش کے الفاظ اور تراکیب کا استعمال کرتے تھے۔

ہندی ادبیات کے اس دور میں (۷۵۰ء تا ۱۱۵۰ء) ہمیں اٹھارہ[1] شاعر ملتے ہیں۔ ان میں سے اکرم فیض۔ نرپتی نالہ۔ چند بردائی۔ جگنک۔ کیوار۔ مدھوکر۔ شری دھر اور شاعرہ ملکتا بائی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہندی کے قدیم ترین نمونے جو اب تک دستیاب ہو چکے ہیں۔ وہ گریرسن کے بقول مشتبہ ہیں۔ شِو سنگھ سروج کے مطابق ہندی کا قدیم ترین شاعر پُشپا یا پُشیا ہے۔ جو سنسکرت اور ہندی دونوں میں شاعری کرتا تھا۔ اس کا زمانہ ۷۱۳ء کے لگ بھگ بتایا جاتا ہے۔ اس عہد کی زبان کے مطالعہ کے لئے سب سے زیادہ مستند مصنف اگلے صفحہ پر ہیں۔

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۳۷ : مشر بندھو : لکھنؤ ۱۹۴۰ء

(۱) بیسل دیو راسو   مصنف   نرپتی نالہ

(۲) پرتھوی راج راسو   "   چند بردائی

(۳) پرتھوی راج اور راول سمر سنگھ کے وہ شاہی پروانے جو ناگری پرچارنی سبھا کے لسانیاتی جائزہ کے دوران میں دریافت ہوئے۔ اور جو ہندی نثر کے قدیم ترین نمونے مانے جاتے ہیں۔

بیسل دیو راسو کا مصنف نرپتی نالہ ہے جس نے اپنے ممدوح اجمیر کے چوہان راجہ وگرہ راج چہارم (۱۱۵۵ء) (عرف بیسل دیو) کے حالاتِ زندگی منظوم کئے تھے۔ تاریخی اعتبار سے اس میں من گھڑنت بہت زیادہ ہے۔ جہاں تک اس کتاب کی زبان کا تعلق ہے وہ معیاری ادبی زبان نہیں بلکہ راجستھانی ہے۔ مثلاً:۔ سو کہئ چھے (سو کہتا ہے) بھوج تنا (بھوج کا)۔ کھنڈ کھنڈرا (کھنڈ کھنڈکا) وغیرہ۔ اس کتاب سے ایک بات کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ شاعری کی زبان میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے بھی بعض الفاظ کا میل کر دیا جاتا تھا۔ مثلاً:۔

(موتی کا آکھا لیا)۔ (سونا کی چوری' موتی کی مال[۱])

اس کے ساتھ ہی نیئر (نگر)۔ پساؤ (پرساؤ) وغیرہ الفاظ کی شکلیں بھی ملتی ہیں جو پراکرت اور اَپ بھرنش کی یاد دلاتی ہیں۔ اس میں کچھ مسلمانی الفاظ بھی آئے ہیں۔ مثلاً:۔ محل۔ انعام۔ نیجا (نیزہ)۔ تاجنو (تازیانہ)۔ ممکن ہے کہ یہ لفظ بعد کو اضافہ کر دیئے گئے ہوں۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ خود شاعر نے استعمال کئے ہوں کیونکہ

---

[۱] ہندی ساہتیہ کا اتہاس ص۳۸ : رام چندر شکل

اس سے قبل مسلمان پنجاب میں عام طور سے پھیل گئے تھے بیبیتی دیو کے سرداروں میں ایک مسلمان سردار تاج الدین بھی موجود ہیں۔

لیکن ہندی کے سب سے پہلے اور بڑے شاعر ہونے کا فخر چند بردائی (۱۱۵۹ء تا ۱۱۹۲ء) کو حاصل ہے جس کی مشہور و معروف تصنیف پرتھوی راج راسو سے متعلق تحقیق کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ یہ دہلی کے آخری ہندو راجہ پرتھوی راج کا دوست، وزیر اور درباری شاعر تھا۔

پرتھوی راج راسو ڈھائی ہزار صفحوں کی ضخیم کتاب ہے۔ اس میں ۶۹ باب ہیں۔ قدیم زمانہ سے جتنے بھی چھند (بحریں) رائج تھے وہ سب اس میں استعمال کئے گئے ہیں، اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس کا آخری حصہ چند کے بیٹے جلہن نے باپ کی ہدایت کے مطابق مکمل کیا تھا۔

راسو کے قصوں کی چونکہ تاریخ سے سند نہیں ملتی اس لئے عرصے سے اس کتاب کے متعلق بحث چلی آرہی ہے۔ ایک طرف گریرسن اس کی قدامت پر صاد کرتے ہیں۔ تو دوسری طرف ڈاکٹر بولر اس کو فرضی قرار دیتے ہیں۔ ایک طرف پنڈت موہن لال وشنو لال پنڈیا مختلف دلائل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ چند کی اصل تصنیف ہے۔ اور ہندی کی سب سے قدیم کتاب ہے تو دوسری طرف جودھپور کے مرآری دھن اور اودھے پور کے شیامل داس نے اس کے خلاف مضامین کا ایک طومار باندھ دیا ہے۔ حال ہی میں رائے بہادر پنڈت گوری شنکر ہیرا چند اوجھا نے نہایت مبسوط دلائل کے ذریعے اس کتاب کو جعلی قرار دیا ہے۔ گو اس کے بعض حصوں کی قدامت کے وہ بھی منکر نہیں۔ لیکن پنڈت ہر پرشاد شاستری جیسے زبردست عالم جنہوں نے

راجپوتانہ میں قدیم کتب کی کھوج میں کئی سال گنوائے ہیں، اُسے قدامت کی سند دیتے ہیں۔

پروفیسر محمود شیرانی، شیامل داس جی کی رائے کو مستند مان کر راسو کو مشتبہ تصنیف قرار دیتے ہیں[1]۔ اُن کے خیال میں یہ سولھویں یا سترھویں صدی کی تصنیف ہے۔ راسو میں ۷۰ فی صدی عربی فارسی الفاظ کا موجود ہونا۔ آتشیں اسلحہ کا ذکر اور دوسری تاریخی غلط بیانیاں اس بات کی دلیل ہیں کہ یہ کتاب بعد کی تصنیف ہے مثلاً۔

(۱) "شہاب الدین کے متعلق اس کے بیانات قطعاً بے بُنیاد اور غیر تاریخی ہیں"۔

(۲) راسو میں کئی جگہ چنگیز اور تیمور کے نام آئے ہیں جو ظاہر ہے بعد کو آتے ہیں۔

(۳) پرتھوی راج کی راج سبھا کے مشہور کشمیری شاعر جیانک نے سنسکرت میں "پرتھوی راج وجے" نام کی ایک کتاب لکھی ہے جس کے واقعات کی سند تاریخ سے بھی ملتی ہے۔ لیکن جو راسو سے بالکل مختلف ہے۔ راسو کے بیانات کی رُو سے سلطان شہاب الدین پرتھوی راج سے بیس[20] مرتبہ شکست کھاتا ہے۔ سلطان کی سات مرتبہ شکست کا قصہ ہندو روایات کی بنا پر ابوالفضل نے بھی تسلیم کیا ہے۔ مگر بالکل غلط ہے اس لئے کہ سلطان شہاب الدین کی سوانح حیات میں اُن شکستوں کا کوئی ذکر نہیں۔

---

[1] دیکھیے اورینٹیل کالج میگزین: مئی ۱۹۳۲: اگست ۱۹۳۵: نومبر ۱۹۳۵: اگست ۱۹۳۶ء اور مقدمہ "پرتھوی راج راسا" (انجمن ترقی اردو ۱۹۴۲)

(۴) بعض ایسے پھولوں اور پھلوں کے نام مثلاً :- گلاب - انناس بیو (سیب) ستوت (شہتوت)، اکھوٹ (اخروٹ)۔ نرنگی (نارنگی) جو مسلمانوں کے ساتھ ہندوستان آئے اور دیگر مسلمانی الفاظ مثلاً :- سکر پارے (شکر پارے) حلبی - آتش - صلح - تیغ - زرہ - کمان - تیر - ترکش - گرز - تفک - ہدف - نشان - چوگان - سوار - لگام - پیلوان (پہلوان) عراقی - تازی - نوبت - شہنائی - نفیری - چنگ - دمامہ - ہزار - باغ - باغباں وغیرہ کی موجودگی بھی کتاب کو مشتبہ بناتی ہے۔ راسو میں فارسی الفاظ ہی نہیں تراکیب تک پائی جاتی ہیں مثلاً :- سرتاج - نیل ماہی - جنگی جوان - زرووزن (بمعنی زرووزی)۔ زرکشی - کسادہ کسادہ (کشادہ کشادہ) کوچ بر کوچ فارسی محاورہ ہے۔ راسو میں دیکھیے۔ ع چلیو کوچ پر کوچ کھری۔ بعض ترکیبیں نیم ہندی اور نیم فارسی ہیں۔ مثلاً :- پلنگ پوش - جم جور (جم = موت : جور = زور)۔

(۵) زبان کی کسوٹی پر کسیے تو اور بھی مایوسی ہوتی ہے۔ گرامر کے لحاظ سے اس میں سقم ہیں۔ زبان کہیں نئی زبانوں کے سانچوں میں ڈھلی معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً روزہ مرہ کھیت پڑنا (کھیت رہنا) اور سر دھننا اور کہیں پر اکرت اور اپ بھرنش کی قدیم روایات میں جکڑی ملتی ہے۔

تاریخی اور لسانی اعتبار سے پرتھوی راج راسو کے خلاف جو دفعات قائم کی گئی ہیں، اُن کو مختصر طور پر اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ لیکن خود اس تصنیف کے اندر بعض ایسی لسانی اور تاریخی شہادتیں موجود ہیں جن کو ابھی تک رد نہیں کیا جا سکا ہے ابھی تک کسی مورخ نے بھی چند کو سولھویں یا سترھویں صدی کا شاعر نہیں بتایا ہے۔ تاریخ کی ہر کتاب میں پرتھوی راج اور چند کا ذکر ساتھ ساتھ ملتا ہے۔ چند اگر

سولھویں یا سترھویں صدی کا شاعر ہوتا تو سور داس اپنا سلسلۂ نسب اس سے نہ ملاتے۔ سورداس اس کے اور اپنے درمیان کئی پیڑھیوں کا فرق بتاتے ہیں جس سے صاف ظاہر ہے کہ چند اُن سے بہت پہلے گذرا ہوگا۔

"چند چھند ورنن مہیما" میں جو (۱۵۷۲ء) کی تالیف ہے مذکور ہے کہ ۱۵۷۰ء میں اکبر بادشاہ نے راسو اپنے درباری شاعر گنگ سے سُنی تھی جس سے واضح ہوتا ہے کہ راسو اکبر کے عہد میں عام مقبول نظم تھی۔ خود ابو الفضل نے راسو سے خوشہ چینی کی ہے۔ آئین اکبری میں وہ اُس قصّے کا ذکر کرتا ہے جس میں اندھا پرتھوی راج، چاند بھاٹ کی نشان دہی سے آواز پر تیر مار کر سلطان شہاب الدین کو ہلاک کر دیتا ہے۔

"چاند از حقیقت منشی و وفاداری بہ غزنیں شتافت۔ وسلطان را ملازمت نمود۔ ونوازش یافت وبہ پختہ کاری راجہ را دریافت و در زندان دمسازی نمود گفت چناں بخاطر من میرسد کہ من نزد سلطان تیر اندازی ترا برگویم ادمیل تماشا خواہد کرد۔ دراں زماں کارہ او را بساز۔ قرار داد بجائے آورد وسلطان را تیر اندوز گردانید۔ ہوا خواہاں راجہ وچاند را از ہم گذرانیدند"[1]

شہاب الدین غوری کی موت کا یہ واقعہ اگرچہ ابو الفضل نے ہندو روایت کی بنا پہ تسلیم کر لیا ہے مگر بالکل غلط ہے۔ سلطان موصوف حسب بیان طبقاتِ ناصری اور تاریخ فخر الدین مبارک شاہ[2] ملاحدہ کے ہاتھوں سے غزنیں جاتے وقت منزل دھیک پر مارا جاتا ہے۔

---

[1] آئین اکبری ص ۵۳۲

[2] ایڈیشن ۱۹۲۷ ص ۲۹

بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ راسو سولھویں صدی عیسوی سے پہلے کی تصنیف ہے۔

لسانی اعتبار سے ہمیں اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اگر کتاب مذکورہ کا بیشتر حصّہ بعد کی تصنیف ہے تو اس کے اکثر ٹکڑے بارہویں صدی کی زبان سے تعلق رکھتے ہیں۔[۱] قدیم زبان کی جو خصوصیات اس کتاب میں پائی جاتی ہیں وہ "راسو عہد" کی کسی دوسری تصنیف میں نہیں ملتیں۔ اس لیے راسو کے متعلق چند تاریخی شہادتوں کی بنا پر یہ فیصلہ کر دینا کہ کل تصنیف جعلی ہے کسی طرح درست نہیں، اس میں شک نہیں کہ اس کے بیشتر حصّے سولھویں اور سترہویں صدی عیسوی کی زبان میں لکھے گئے ہیں، لیکن تلاش کرنے سے اصل مصنّف کے ٹکڑوں کی پہچان کوئی مشکل بات نہیں۔

راسو کی زبان کا تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس میں جہاں پراکرت اور اپ بھرنش کے (سمگ۔ جگّ۔ ہاتھ۔ اوتھ۔ ہتّی۔ کھگّ) وغیرہ اسمار اور (چھبیہ۔ چھٹیہ۔ کٹّی یو) وغیرہ افعال آئے ہیں۔ اس میں (رہے۔ کپاٹ۔ اور دل۔ جل) خاص سنسکرت کے الفاظ مِل جاتے ہیں۔ یہ پراکرتی میلان کے خلاف شاعر کی "ایجاد بندہ" ہے۔ کیونکہ پراکرت اور اپ بھرنش میں سنسکرت کے تحت سم (خالص) الفاظ کا فقدان ہوتا ہے۔ یہی اصل پراکرت کی پہچان بتائی گئی ہے۔ چند نے (न) کی جگہ پر (ण) کا استعمال بھی کیا ہے۔ اور یہ اپ بھرنش کی بجائے قدیم ہندوستانی زبان کی خصوصیّت مانی جاتی ہے۔ آج بھی ہریانی، کھڑی بولی، راجستھانی اور پنجابی کے علاقے میں (ण) کی آواز سنائی دیتی ہے۔ لیکن برج اور اودھی ہندوستانی (ہندی

۱؎ ہندی بھاشا اور ساہتیہ ص۹۵؛ شیام سندر داس اور انڈو ایرین اور ہندی ص۱۶۶؛ ڈاکٹر چیٹرجی۔

اور اُردو دونوں) اور دکنی میں یہ ہمیشہ (ن) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جن نمونوں کا حوالہ دیا گیا ہے اُن میں بعض ایسے فعل بھی آئے ہیں جو برج بھاشا کے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً "اڑی چلیو"، "آئیو"، "کری" چند کے یہاں اَپ بھرنش کے برعکس (اَ) کی جگہ برج بھاشا کے (اَو) کا کثرت استعمال پایا جاتا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ "پنگل" بعض اوقات "ڈنگل" کی گود میں بیٹھا نظر آتا ہے۔ بعینہٖ بعد کو جیسے کھڑی بولی اوّل اوّل برج بھاشا کی گود میں نظر آتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کی گدّی چھین لیتی ہے۔

گریرسن نے راسو کے اشعار کی تعداد ایک لاکھ کے قریب بتائی ہے[۱]۔ جس سے ظاہر ہے کہ چند کی راسو کا حجم زمانہ کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ چند کی شخصیت کے ساتھ ہندوؤں کو محض شاعرانہ عقیدت نہیں بلکہ روحانی تعلق بھی رہا ہے۔ وہ ہندوؤں کے آخری سمراٹ کا "راج کوی" تھا۔ اِس لئے اس کی تصانیف ہر ہندو کے لئے داستان پارستان کی حیثیت رکھتی تھی جس میں اضافہ کرنا ہر شاعر اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا تھا۔ اُنہیں اضافوں کی بدولت راسو کے اکثر حصّے سولہویں اور سترھویں صدی کی برج بھاشا میں لکھے دکھائی دیتے ہیں جنہیں بہت آسانی سے پہچانا جا سکتا ہے۔

چند نے عربی فارسی الفاظ کو ہندی عروض اور صوتیات کے مطابق اپنی شاعری میں اس طرح باندھا ہے کہ اس کا جواز نہ تو پراکرت میں ملتا ہے۔ اور نہ اَپ بھرنش میں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت کی زبان ایک خاص ڈول اختیار کر رہی تھی جس میں راجستھانی لب و لہجہ کو امتیاز حاصل تھا۔ مثلاً سلیم کو دسلیم، کمال کو دکمال، عربی کو دعربی،

---

[۱] ماڈرن ورناکر لٹریچر آف ہندوستان صہ ۳

ترکی کو (ترکی)، کمان کو (کمان)۔ راسو کے قدیم ترین حصّوں سے یہ بات بھی ظاہر ہے کہ وہ اُس وقت کی معیاری درباری زبان میں لکھی گئی ہے جس میں راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کی وجہ سے قدیم راجستھانی۔ اَپ بھرنش کی جھلک کافی مل جاتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ دہلی کے آس پاس کی زبان بالکل مُردہ تھی۔ حال ہی میں ناگری پرچارنی سبھا نے راول سمر سنگھ اور پرتھوی راج کے نو دان پتروں (شاہی پروانوں) کا پتہ لگایا ہے۔ راول سمر سنگھ کے پروانے راجستھانی زبان میں ہیں۔ لیکن پرتھوی راج کے پروانوں سے پرانی کھڑی بولی کی شکل جھلکتی ہے۔ پرتھوی راج نے چونکہ دہلی کو راجدھانی بنایا تھا اس لئے وہاں کی زبان سے متاثر ہونا ضروری تھا۔ لیکن دہلی (پُرانا اندرپرست) ہریانی کے علاقہ میں واقع تھی۔ اس لئے اس کی بھی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ بارہویں صدی عیسوی کے ایک پروانہ کی زبان منقول[۱] ہے۔

"شری شری دلیں مہاراجم دھیراجنم ہندوستھانم راجم دھانم سمبھری نریس پورب دلی تشت شری شری مہانم راجم دھیراجنم شری پرتھوی راج سوساتھنم آچارج اُشی کیش دھنم تری اپرن تم نے کا کاجی تم کے دوا کی آرام چٹو جین کے ریچ میں راگڑ روپیہ ۰۰۰ ۵ تمرے آبائی گوڑے کا کھرچہ سیوائے آدیں گے۔ کھجانم سے اِنم کو کوئی معاف کریں گے جین کو نیر کے اندھکاری ہودیں گے۔ سنی دوبے حکم کے ہڈ منت راسمنت ۱۴۵ اور شے آساڑھ شری ۱۳ "

---

[۱] دیکھئے مشر بندھو حصّہ اوّل صفحہ ۱۲۶ تا ۱۲۷ اور ہندی بھاشا اور اس کے ساہتیہ کا وکاس۔ ہری اودھ۔

ترجمہ۔" شری شری مہاراج دھیراج پرتھوی راج جی (حکمران) ہندوستان دلی پوربی ہندوستان کے مہاراج دھراج سبھی راجاؤں کی راجدھانی نے اچارج رشی کیش دھن دنتری کو (دیا) تم نے کاکا جی کی دوا کرکے انہیں اچھا کیا ہے۔ جس کے سبب ... ۵ نقد اور ہاتھی، گھوڑے کا خرچ تمھیں شاہی خزانہ سے بھیجا جائے گا۔ اس حکم کے پورے ہونے میں جو کوئی رکاوٹ کریں گے۔ وہ دوزخ جائیں گے۔ ہنومنت کے ذریعہ یہ حکم ہوا۔

سمبت ۱۱۴۵ - اساڑھ سری ۱۳"

یہ پروانہ آنند سمبت ۱۱۴۵ میں لکھا گیا جس کا بکرم سمبت ۱۲۳۵ ہوتا ہے۔ اور سن عیسوی کے اعتبار سے یہ بارہویں صدی کے ہوتے ہیں۔ باقی پروانوں کی زبان راجستھانی سے متاثر نظر آتی ہے۔ اِن میں ذیل کے افعال خالص کھڑی بولی کے ہیں۔

لیوے گا۔ دیوے گا۔ لایا۔ جائے گا۔ کرے گا۔ آویں گے۔

ماضی کی (ا) اور مستقبل کی (گ) علامتیں پنجابی کے لئے مخصوص نہیں۔ اِن پروانوں کی زبان سے صاف ظاہر ہے۔

مندرجہ بالا پروانے میں بعض اسماء اور افعال قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً ہندوستان کو ہندوستھان (ہندو + استھان = جگہ) لکھا گیا ہے۔ فارسی کا 'ستان' سنسکرت کا 'استھان' مرکب الفاظ میں خالی "ستھان" ہے۔ پنڈتوں کے حلقوں میں آج بھی "ہندوستانی" کی بجائے "ہندوستھانی" کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر ایس۔ کے چیٹرجی لفظ کی اِسی شکل کو رواج دینا چاہتے ہیں[1]

---

[1] دیکھئے انڈو آرین اور ہندی صفحہ ۱۵۵ گجرات ورناکلر سوسائٹی ۱۹۴۲ء

اس کے علاوہ تُم نے کو تَم نے لکھا گیا ہے. جو آج بھی کھڑی بولی کے علاقے میں بولا جاتا ہے. بعض فارسی الفاظ دوا، خزانہ، پرچہ، آرام، حکم وغیرہ بھی نظر آتے ہیں. جن کا عام مستعمل ہونا بعید از قیاس نہیں کیونکہ اس وقت مسلمان سارے پنجاب میں پھیل چکے تھے۔

۱۹۱۲ء کا ایک اور خط پرتھوی راج کی بہن پر تھا بائی کا دستیاب ہے جو اس نے ستی ہونے سے پہلے اپنے بیٹے کو لکھا تھا.

"سری حضور سمر (جنگ) میں مارے گئے اور ان کے سنگ رشی کیش بھی بیکنٹھ کو پدھارے ہیں. رشی کیش جی اُن چار لوگوں میں سے ہیں جو دلّی سے میرے سنگ دہیز میں آئے تھے. اس لئے ان بنسجوں (کنبہ والوں) کی کھاتری (خاطرداری) راکھنا. نے (اور) پاپچھے مارا. چیاری گراں (چاکری گر یعنی چاکر) منشاں (آدمیوں) کی کھاتری راکھجو. اِی (یہ) ماراجیو کا چاکر ہے. جو تھاسو (تم سے) کدی (کبھی) حرام کھوری (حرام خوری) نیوے گا (نہیں کرے گا)۔"[۱]

پنڈت اوجھا اور پروفیسر شیرانی[۲] ان پروانوں کی زبان کے نئے پن کو دیکھ کر اُنہیں جعلی قرار دیتے ہیں لیکن سمبت درج ہونے کی صورت میں اُنہیں ابھی تک صحیح مانا جاتا ہے. اِس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیئے. کہ اَپ بھرنش ادبیات کے

---

[۱] کیفیہ ص ۱۹

[۲] پرتھوی راج راسا ص ۲۶۷ تا ص ۲۷۶

نمونوں سے ہم اس وقت کی عام بول چال یا کام کاج کی اور راج پاٹ کی زبان کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں لگا سکتے۔ لِسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں اِن ادبی نمونوں پر کافی سے زیادہ زور دیا گیا ہے جو ٹھیک معلوم نہیں ہوتا۔[۱]

مسلمانوں کی فتح دہلی سے قبل وہاں کی ادبی اور راج پاٹ کی زبان کی جو شکل تھی اس کی جھلک پچھلے صفحات میں دکھائی جا چکی ہے۔ ابھی تک اس علاقے کی نئی بولیوں (برج بھاشا، کھڑی بولی، ہریانی) نے سر نہیں اُٹھایا تھا۔ بلکہ اَپ بھرنش کی ایک جدید شکل (قدیم ہندی) یکساں طور پر اِن بولیوں کے علاقوں میں ادبی اور معیاری زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ جس پر راجستھانی کا گہرا اثر نظر آتا ہے مسلمان جب فاتحین کی حیثیت سے دہلی میں داخل ہوئے۔ تو علاوہ مقامی بولیوں کے اِسی 'ہمہ گیر' ادبی زبان سے اُن کا سابقہ پڑا۔ لیکن فتح دہلی سے کئی سو سال قبل مسلمان پہلے سندھ اور بعد کو پنجاب پر قابض ہو چکے تھے۔ اِس لئے داستان کا آغاز وہیں سے ہونا چاہیئے۔ سندھ ۷۱۲ء میں فتح ہوا اور ہمیشہ کے لئے اسلامی

---

[۱] اس قسم کے دس فرامین موجود ہیں انھیں ۱۹۰۳ء میں شیام سندر داس نے شائع کیا تھا۔ مرتب کا دعویٰ ہے کہ یہ تحریریں پرتھوی راج، اسکی بہن پرتھا بائی اور بہنوئی رانا سمر سنگھ کے فرامین ہیں جو آچاریہ رشی کیش (طبیب شاہی) کے نام جاری ہوئے تھے۔ شیرانی خیال میں یہ پرعلانیہ وضعی اور جعلی ہیں۔ اِن میں حسبِ ذیل مسلمانی الفاظ پائے جاتے ہیں!

داج (دہیز۔ جہیز)، مالکی۔ جنانہ (زنانہ)۔ برو بر (برابر)۔ جا کر جما کھاتری (جمع خاطر) ہروانہ۔ تکھت (تخت)۔ ہک (حق)۔ ثابت۔ اولاد۔ کھاس (خاص)۔ روکا (رقعہ) ہاجر (حاضر) ہجور (حضور)۔ کاگد (کاغذ)۔ ہکم (حکم)۔ تاکید۔ دوا۔ آرامن (آرام)۔ روپیہ۔ کھرچا (خرچہ) کھجانہ (خزانہ)۔ ماف (معاف)۔

سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا دو سو سال کے بعد صفاریوں کی فتوحات کے ذریعہ ایرانی اثرات بھی یہاں پھیل گئے۔ اس وقت کے سیّاحوں (جن کے سفرناموں کی تفصیل سید سلیمان صاحب ندوی نے اپنی بے مثل کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" میں دی ہے) کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربی فارسی زبانیں سندھ میں گھر کر چکی تھیں۔ اور علمی و ادبی حلقوں میں اُنہیں کو رواج حاصل تھا۔ تاریخی تحقیق کے لئے ان سفرناموں میں کافی مواد مل جاتا ہے۔ جس کی تفصیل سید صاحب نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں دی ہے لیکن لسانیات کی رُو سے یہ زیادہ مستند اس لئے نہیں کہ یہ سیاح عموماً ہندوستان کی زبانوں سے ناواقف تھے۔ دوسرے یہ کہ جو ہندوستانی الفاظ (مثلاً نارجیل (ناریل)، دیب (جزیرہ)، جزر (گجر) طافن (دکن)۔ سنڈال (چنڈال)۔ زاط (جاٹ) رہبوط (راجپوت)[1] وغیرہ) جو اُنھوں نے اپنے سفرناموں میں درج کئے ہیں وہ معرب کر لئے گئے ہیں۔ البتہ البیرونی جس نے ۱۰۱۷ء تا ۱۰۲۹ء کے درمیان ہندوستان کی سیاحت کی، مستند سمجھا جا سکتا ہے۔ بیرونی کا تعلق مسعود اور مودود کے درباروں سے بھی رہا۔ وہ سنسکرت کا عالم تھا۔ اور لسانیاتی تحقیق کے لئے کافی مواد اپنی دو تصانیف 'کتاب الہند' اور 'کتاب الصیدنہ' میں چھوڑ گیا ہے۔ لیکن اس کی سیاحت کا محور اور دائرہ وادیٔ کابل، پنجاب اور سندھ تک محدود تھا۔ سنسکرت سے واقف ہونے اور لسانی مذاق رکھنے کے باوجود بیرونی اپنے سفرنامہ میں ہندوستانی زبانوں کو ہمیشہ "الہندیہ" کہہ کر پکارتا ہے۔ ہندوستانی زبان کے جو الفاظ بیرونی کی تحریروں کے ذریعہ ہم تک پہونچے ہیں وہ سنسکرت کے نہیں بلکہ اُس عام بول چال

---

[1] اورینٹل کالج میگزین: مئی ۱۹۴۳ء: قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ۔

کی زبان کے الفاظ ہیں جو اس زمانہ میں مغربی پنجاب سے لے کر ملتان اور سندھ تک رائج تھی چونکہ دوران سیاحت میں اس کا قیام عرصہ تک ملتان میں رہا اس لیے بیشتر الفاظ وہاں کی بولی کا پتہ دیتے ہیں۔

کتاب[1] الہند سے ہندوستانی مہینوں کے نام :-

چیتر۔ بیشاک۔ جیرت۔ آشاڑ۔ شرابن۔ بہادرو۔ اشوج۔ کارتک۔ منگھ۔ پوشس۔ ماگھ۔ پاگن۔

اعداد :-

برقتہ۔ (برکت) بمعنی ایک : مغربی پنجاب میں آج بھی برکت کہہ کر گنتی شروع کی جاتی ہے۔ بیہ (دو)۔ تریہ (تین)۔ چوت (چار)۔ پنچی 'پنچ (پانچ) چھ۔ ست (سات)۔ آتیں (آٹھ)۔ نوں (نو)۔ دھیں (دس : مغربی پنجابی میں 'س' کی آواز عام طور سے فارسی کی طرح (ہ) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یاہی (گیارہ) دہلی والے آج بھی گیارہ کو 'یاراں' کہتے ہیں)، دواہی (بارہ)۔ تروہی (تیرہ)۔ چودھی (چودہ)۔ پنچاہی (پندرہ)۔

ذیل کے الفاظ بھی ملتے ہیں :-

رس۔ ناگ۔ ماش۔ چنا۔ پل۔ بھا۔ (ایک وزن)۔ کوڈہ (کوڑی)۔ کرتکا (کرتا)۔ برش (برس)۔ رتھ۔ تارا۔ شرد (موسم خزاں۔ آج بھی مغربی پنجاب میں مستعمل ہے)۔ گنڈہ (گینڈا)۔ وسنت (بسنت)۔ دیبالی (دیوالی)۔ ناؤ۔ چتر۔

کتاب الصیدنہ میں حسب ذیل ہندی مترادفات ملتے ہیں۔

آملہ۔ پودنہ۔ بیش (بس)۔ دیوار۔ چارہ (معلوم ہوتا ہے اس زمانے میں رواج

---

[1] اورینٹل کالج میگزین : مئی ۱۹۳۹ء : قدیم عربی تصانیف میں ہندوستانی الفاظ۔

پا چکی تھی)۔ تج (دارچینی، اب تک بنگالی اور دکنی میں مستعمل ہے)۔ مرچ (پنجاب میں مرچ کو ابھی تک مرچ یا مرچ میم مفتوح بولا جاتا ہے۔ لونگ۔ کیوڑہ۔ جیرو (زیرہ۔ سنسکرت جیرکا)۔

مذکورہ بالا الفاظ میں پنجابی اور سندھی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔ اعداد خالصتہً مغربی پنجابی (ملتانی) کے ہیں۔ ادویات میں البتہ عمومیت پائی جاتی ہے۔ اور وہ موجودہ زبان سے زیادہ مختلف بھی نہیں۔

محمود غزنوی کی فتوحات (۱۰۲۱ء) کے بعد لاہور اسلامی تمدن کا مرکز بن جاتا ہے۔ لاہور مغربی اور مشرقی پنجابی کے مقام اتصال پر واقع ہے۔ لیکن یہاں کی بولی ملتان اور راولپنڈی کی زبان کی بہ نسبت مشرقی پنجاب اور دہلی کی بولیوں سے زیادہ قریب ہے۔ لاہور کی دیسی "ترکی، ہندی" (محمود غزنوی سے ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے جو سندھ کی اسلامی فتوحات سے معناً ولساناً مختلف تھا) فضا میں خواجہ مسعود سعد سلمان (متوفی ۱۱۲۵ء اور ۱۱۳۰ء کے درمیان) پرورش پاتے ہیں۔ مسعود فارسی اور ترکی زبانوں کے قادر الکلام شاعر ہونے کے علاوہ ہندوی زبان (؟) کے بھی پر گو شاعر تھے۔ جس کی شہادت محمد عوفی صاحب لب الالباب اور امیر خسرو کی تحریروں سے ملتی ہے۔

"دادر اسہ دیوان است یکے بہ تازی دیکے بہ پارسی دیکے ہندی[1]" (محمد عوفی)

حضرت امیر خسرو اپنے دیباچہ "غرۃ الکمال" میں لکھتے ہیں:۔

"پیش ازیں از شاہان سخن کسے راسہ دیوان نہ بود مگر مرا کہ خسرو ممالک کلامم۔

---

[1] بحوالہ نقوش سلیمانی صـ ۲۴۹

خواجہ مسعود سعد سلمان را اگرچہ ہست آقا آں سہ دیوان در عبارت عربی و فارسی و ہندوی است در پارسی مجرد کسے سخن را سہ قسم نہ کردہ جز من کہ دریں کار قسام وحاو لم[1]"

چنانچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خواجہ مسعود کسی ہندوی (؟؟) زبان میں بھی شاعری کرتے تھے۔ اور شاید ان کا دیوان خسرو کے وقت تک دستیاب تھا۔ اس کے علاوہ لاہور میں فارسی اور نثر کی شاعری کا بھی خوب چرچا تھا۔ نمونہ کی عدم موجودگی میں یہ بتانا ذرا مشکل ہے کہ یہ ہندوی زبان کون سی زبان تھی؟ یقیناً امیر خسرو اور ابوالفضل کی "زبان لاہوری" ہو گی، جو ان کی "زبان دہلوی" سے بالکل مختلف تھی!!

(پنجاب پر غوریوں کے حملے ۱۱۶۸ء سے شروع ہو جاتے ہیں۔ ۱۱۹۳ء میں بالآخر محمد غوری دہلی کے آخری ہندو سمراٹ پرتھوی راج کو شکستِ فاش دینے کے بعد دہلی اور اجمیر پر قابض ہوتا ہے۔ دہلی اس کے بعد ہندوستان کا دارالسلطنت قرار پاتا ہے۔ پروفیسر شیرانی نے لاہور سے دہلی کو پایۂ تخت کے اس انتقال پر بہت زور دیا ہے۔ حالانکہ یہ محمد تغلق کے انتقالِ پایۂ تخت کی طرح نہ تھا جس نے دہلی اور اس کے اطراف کی بیشتر آبادی کو یک لخت گرم سفر ہو جانے کا حکم دیا تھا۔ لاہور اس کے بعد بھی پنجاب کے صوبہ کا صدر مقام رہا۔ اس لئے دہلی بننے کے یہ معنی نہ تھے کہ لاہور اُجاڑ دیا گیا تھا۔ تاریخ سے اس بات کی شہادت نہیں ملتی کہ لاہور کی آبادی نے کبھی بڑے پیمانہ پر دہلی کو ہجرت کی ہو۔

گریرسن نے اپنے لسانیاتی تبصرہ ہند میں کھڑی بولی کا جو رقبہ مقرر کیا ہے۔

---

[1] بحوالہ "پنجاب میں اردو" صفحہ ۳۸

وہ مغربی روہیلکھنڈ سے لیکر ضلع انبالہ کی مشرقی تحصیلوں تک اور شمال میں دہرہ دون کے میدانی علاقوں سے دہلی تک پھیلا ہوا ہے۔ پروفیسر شیرانی کے اس نظریہ کو اگر تسلیم کر لیا جائے کہ "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان پنجاب سے ہجرت کر کے جاتے ہیں اس لئے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے گئے ہوں گے"[1] تو بعض عجیب وغریب نتائج مرتب کرنا پڑتے ہیں۔

(۱) لاہور سے پایۂ تخت جب دہلی منتقل ہوتا ہے تو ایک بہت بڑے پیمانے پر لاہور کی آبادی ہجرت کر کے دہلی آجاتی ہے۔ یہ ہجرت اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی ہوگی کہ اس کی بدولت دوآبہ گنگا جمنا کے بالائی حصے اور دہلی کے اطراف میں ایک نئی زبان کی داغ بیل پڑ گئی یعنی کھڑی بولی یا گریرسن کی ہندوستانی مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے بعد پیدا ہوئی۔

(۲) چونکہ بقول شیرانی "ہریانی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں ہے۔ بلکہ وہ پرانی اردو ہے یعنی وہ اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں بھی بولی جاتی تھی"[2] اس لئے ثابت ہے کہ خود ہریانی کی پیدائش اس بڑے نقلِ مکان کے بعد ہوئی۔ اس طرح لاہوری قافلے والوں کی زبان نہ صرف دوآبہ کے بالائی حصے پر اثر انداز ہوتی ہے بلکہ صوبہ دہلی کرنال اور حصار (ہریانی کے علاقے) کے اضلاع بھی اس کے تحت آجاتے ہیں۔

---

[1] پنجاب میں اردو (مقدمہ)

[2] پنجاب میں اردو (مقدمہ)

یہ نتائج مرتب کرنے کے بعد فوراً یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ اگر ہریانی اور کھڑی بولی (ہندوستانی یا دہلوی) کا جنم پنجابی قافلہ کا مرہونِ منت ہے تو ان علاقوں میں فتح دہلی سے قبل کونسی زبان رائج تھی؟ شیرانی اس کا جواب دیتے ہیں۔ "کہ وہ راجستھانی ہوگی یا برج۔ اس میں شک نہیں کہ آج دہلی، میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور یا دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے کہ دوآبہ میں اُردو بولی جاتی ہے۔ لیکن اب سے تین صدی پیشتر اس علاقہ کی زبان یہ نہ تھی بلکہ یہاں برج کا طوطی بول رہا تھا۔ مغلوں کی آمد کے وقت گنگوہ ضلع سہارن پور میں شیخ عبدالقدوس گنگوہی (متوفی ۹۴۵ھ/۱۵۳۸ء) باوجودیکہ ایسے علاقہ سے تعلق رکھتے تھے جہاں آج اُردو مادری زبان ہے۔ لیکن وہ اپنے ہندی اشعار ایسی زبان میں لکھتے ہیں جو برج کے مماثل ہے۔ علیٰ ہذا مخدوم بہاء الدین برناوی، برناوہ ضلع میرٹھ کے ہیں۔ لیکن ان کے ہندی اشعار قطعاً برج میں ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ دوآبہ میں برج زبان ہی مستعمل تھی۔ اُردو نے ان علاقوں سے برج کو رفتہ رفتہ خارج کر دیا ہے جس طرح ہریانہ کے علاقہ سے۔"

اس نظریہ کے ثبوت میں شیرانی کوئی قدیم شہادت یا سند پیش کرنے سے مجبوری ظاہر کرتے ہیں۔ اس کے بعد لکھتے ہیں۔ "لیکن سیاسی واقعات اُردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہمیں اس عقیدہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔"[1]

جہاں تک سیاسی واقعات کا تعلق ہے ہم اوپر بالتفصیل بیان کر چکے ہیں کہ تاریخ سے کوئی ایسی سند نہیں ملتی جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ صرف شہر دہلی بلکہ اس کے اطراف کے علاقوں میں لاہوریوں کا کبھی بھی زور رہا ہو۔ اس کے برعکس تاریخ اس بات پر شاہد ہے۔

---

[1] پنجاب میں اُردو (مقدمہ)

کہ ایک مرتبہ پایۂ تخت قرار پا جانے کے بعد سیاسی اور لسانی لہریں دہلی سے پنجاب کی طرف جاتی رہی ہیں۔ اسکی شہادت گرو نانک کی شاعری میں مل جاتی ہے جس کا تفصیلی جائزہ اگلے باب میں لیا جائے گا۔ آدی گرنتھ صاحب میں بے شمار کھڑی بولی (دہلوی زبان) کی شکلیں مل جاتی ہیں۔

مسلمانوں کے فتح دہلی سے قبل راجپوتی عہد میں زبان کا کینڈا کیا تھا۔ اس کا بیان پچھلے باب میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ وہ نہ تو برج بھاشا ہے نہ کھڑی بولی بلکہ اس عہد کی قدیم اپ بھرنش کی روایات میں جکڑی ہوئی زبان ہے۔ جس پر راجستھانی کا اثر نمایاں ہے۔ دراصل ہندوستان کی جدید بولیوں کی پیدائش صحیح معنوں میں ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ خاص طور سے ادب نے ابھی انہیں منہ نہیں لگایا تھا۔ اسی لئے ان زبانوں کے مستند نمونے سولہویں صدی سے زیادہ پرانے نہیں۔ "پنجابی کے قدیم ترین تحریری نمونے آدی گرنتھ صاحب میں محفوظ ہیں[1]۔" یہی نمونے ہر لحاظ سے مستند ہیں گورکھ ناتھ اور گوپی چند کے 'شبد' اس سے پہلے (۱۴ ویں صدی عیسوی) کے ہیں لیکن وہ مشتبہ ہیں۔ برج بھاشا کا بھی یہی حال ہے۔ جس کے متعلق ڈاکٹر دھیریندر ورما بڑی تحقیق کے بعد لکھتے ہیں :-

"مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ برج بھاشا سے متعلق پندرہویں صدی عیسوی تک کے نمونے نہ ہونے کے برابر ہیں[2]۔"

ہریانی زبان میں اورنگ زیب کے عہد تک کوئی ادب نہیں ملتا (اب رہی کھڑی بولی جس کی شکل ہم قدیم ہندی کے ادب میں پہچانتے آئے ہیں پہلی بار مسلمانوں ہی کے ہاتھوں

---

[1] پنجابی کی صوتیات : بنارسی داس جین : پنجاب یونیورسٹی۔
[2] برج بھاشا دیا کرن ص۳۱ الہ آباد ۱۹۳۷ء

ایک نئے عروض اور نئے رسم الخط میں ڈھلتی ہے، لیکن یہ بھی مسلمانوں کے دہلی میں اچھی طرح متمکن ہو جانے کے بعد ہوتا ہے۔ پروفیسر ژول بلوک کی رائے ہے کہ اوّلین سلاطین کے عہد کی دہلی کو تمدنی اور لسانی اعتبار سے ہندوستان میں بہت زیادہ بلند مرتبہ حاصل نہ تھا۔ اسوقت اس کی حیثیت تمدنی مرکز کی بجائے فوجی چھاؤنی کی زیادہ تھی[1]۔

اپنے نظریہ کی تائید میں شاید شیرانی کی سب سے کمزور دلیل یہی ہے کہ پنجابی مسلمانوں کی آمد سے قبل کے دوآبہ کے بالائی حصص کی زبان برج بھاشا تھی۔ حالانکہ اس وقت تک برج کا ارتقا بھی پورے طور پر نہ ہو سکا تھا۔ اس کے ثبوت میں وہ فتح دہلی کے ساڑھے تین سو برس بعد کے دو مصنفوں (شیخ عبدالقدوس گنگوہی اور مخدوم بہاء الدین) کی تحریروں کا حوالہ دیتے ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ چند اشعار اور فقرے جو اُن صوفیائے کرام سے منسوب ہیں کہاں تک مستند ہیں۔ لسانیاتی تحقیق اور فیصلے چند بولوں یا فقروں کی بنا پر نہیں کئے جا سکتے۔ اس کے لئے ہمیشہ مستند مواد چاہیئے۔ علاوہ ازیں خود سلاطین مغلیہ کے زمانے میں (جبکہ کھڑی بولی نکھر چکی تھی) کھڑی بولی کے علاقے میں رہنے والے دھڑلے سے برج بھاشا میں شاعری کر رہے تھے۔ سولھویں اور سترہویں صدی میں دراصل برج بھاشا اپنی سولھویں یا سترہویں ہی سال میں تھی۔ اور اپنی ماں شورسینی اپ بھرنش کی طرح شمالی ہندوستان کے ایک بہت بڑے علاقے کی ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔ راجپوتانہ کے بھاٹ قدیم زمانہ سے ڈنگل کے ساتھ پنگل (قدیم برج) میں بھی شاعری کرتے تھے۔ وَلی کی آمد کے بعد تک دہلی میں برج میں شاعری کرنیوالے موجود تھے۔

---

[1] ہندی آریائی لسانیات کے بعض مسائل : B.S.O.S. 38

اس کا یہ مطلب نہیں کہ دہلی اور راجپوتانہ کی زبان برج بھاشا تھی۔ برج بھاشا کی دھاک خان آرزو کے عہد تک بیٹھی ہوئی تھی۔ اُنھوں نے اپنی لغت میں بار ہا اسی زبان سے سند چاہی ہے۔ لفظ "آکل" کے سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"چوبے کہ در میش در انگنند تا زود ہا زنہ شود ..... لیکن آکل زبانِ وطنِ مصنف خود بود و بہ زبان گوالیار کہ افصح زبان ہائے ہندی است 'پندہ' گویند وغیرہ[1]"

دوبارہ لفظ "ایوارا" کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ایوارا زبان صاحب رسالہ بود بہ زبان برج و گوالیار کہ افصح است، آں را کھرک گویند[2]"

ہندوؤں کا ایک بہت بڑا طبقہ اب تک صرف سورداس کی اس زبان (برج) کو شعر کے اہل سمجھتا ہے۔ چنانچہ زمانہ حال تک کھڑی بولی اور برج بھاشا کا جھگڑا ہندو ادیبوں میں چلتا رہا ہے۔

ہندوستانی (کھڑی بولی) کی قدامت کا مزید تاریخی ثبوت امیر خسرو (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء)، شیخ باجن (متوفی ۱۵۰۶ء) اور ابوالفضل کی تحریروں سے ملتا ہے۔ تینوں نے "دہلوی زبان" کی علیحدہ حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ صاحب "پنجاب میں اردو" اپنے نظریہ کا بطلان خود اس طرح پیش کرتے ہیں۔ "باجن پہلے شخص ہیں جنھوں نے اُردو زبان کو "زبانِ دہلوی" کے نام سے یاد کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُعدان ایام

---

[1] تصحیح غرائب اللغات ہندی: قلمی نسخہ لٹن لائبریری۔

[2] تصحیح غرائب اللغات ہندی: قلمی نسخہ لٹن لائبریری۔

میں برج سے علیحدہ مانی جاتی تھی۔[1] لیکن اس سے بھی پہلے امیر خسروؔ نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں حسب ذیل ہندوستانی بولیوں کے نام گنائے ہیں۔ جن میں "دہلوی" بھی نظر آتی ہے۔ اصل متن یہ ہے۔

"چونکہ میں ہندوستان میں پیدا ہوا ہوں اس لئے چند کلمات اس کی زبانوں کے متعلق بھی کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت ہر صوبہ کی جداگانہ بولی ہے جو اُس کی اپنی اور مخصوص اور کسی دوسری زبان سے ماخوذ نہیں۔[2]"

(۱) سندھی (۲) لاہوری (۳) کشمیری (۴) بنگالی (۵) گوڑی (گوڑ بنگال کا ایک حصہ ہے) (۶) گجراتی (۷) تلنگی (۸) معبری (کرناٹکی جس کو کنٹری بھی کہتے ہیں) (۹) دھور سمندری (دھور سمندر کارومنڈل کا پایہ تخت جو اس زمانہ میں تازہ فتوحات میں سے تھا) (۱۰) اودھی (۱۱) دہلوی (اور اس کے اطراف کی زبان)۔

امیر خسروؔ کے تین سو برس کے بعد اکبر کے عہد میں بھی ہندوستان کے مختلف صوبوں میں یہی بولیاں رائج تھیں۔ ابوالفضل نے ہندوستان کی مستقل زبانوں کی فہرست یہ دی ہے۔
(۱) دہلوی (۲) بنگالی (۳) ملتانی (۴) مارواڑی (۵) گجراتی (۶) تلنگی (۷) مرہٹی

---

[1] شیخ باجن متوفی ۹۱۲ھ اس کو زبان دہلوی کے نام سے یاد کرتے ہیں وہ کہتے ہیں "صفت دنیا بزبان دہلوی گفتہ" اس سرخی کے ذیل میں انہوں نے اشعار ذیل لکھے ہیں۔ یہ اردو اشعار کا قدیم ترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔

یہ فتنی کیا کہے یہ ملتی ہے
جب ملتی ہے تب چھلتی ہے

پنجاب میں اردو ص ۲۱

[2] تاریخ ہند: ایلیٹ اور ڈوسن ص ۵۶۲ جلد سوم ضمیمہ

(۸) کرناٹکی (۹) سندھی (۱۰) افغانی (۱۱) سندھ کابل اور قندہار کے بیچ کا علاقہ)۔

(۱۲) بلوچستانی (۱۳) کشمیری۔[1]

ابوالفضل کا زمانہ چونکہ فتح دہلی کے بہت بعد کا ہے۔ اس لئے اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اس وقت تک پنجابی مسلمانوں کے زیرِ اثر نئی زبان (کھڑی) متشکل ہو چکی تھی۔ لیکن خسروؔ اور باجن نے دہلی بسنے کا زمانہ دیکھا تھا اس لئے ان کی تقسیم زبان اہمیت رکھتی ہے۔ خسروؔ کا بیک وقت دہلوی اور لاہوری زبان کا ذکر کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان دونوں زبانوں میں امتیاز بھی کرتے تھے۔ یہاں پر یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ انہوں نے صرف ان زبانوں کے نام گنائے ہیں جن کے درمیان موٹے موٹے طریقے پر تمیز کی جا سکتی ہے۔ برج بھاشا کا کہیں ذکر نہیں۔ خسروؔ کا زمانہ اوّلین سلاطین دہلی کا عہد ہے۔ اگر اردو پنجاب سے سفر کرتی ہوئی دہلی پہونچتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پون صدی کے اندر اندر اس میں اتنے حیرت انگیز انقلابات ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنی اصل (یعنی لاہوری زبان) سے بالکل مختلف نظر آتی ہے؛ ورنہ خسروؔ اس طرح دہلوی اور لاہوری زبانوں میں امتیاز نہ کرتے۔ خسروؔ کی تقسیم زبان سے جس لسانیاتی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے یہ ہے کہ مسلمان پنجاب سے فارسی آمیز یا جدید پنجابی بولتے دہلی میں داخل ہوتے ہیں۔ دہلی میں اور اس کے پاس پاس ان کی مڈبھیڑ کئی بولیوں سے ہوتی ہے۔ آس پاس کے علاقوں میں ایک طرف پرانی ہریانی اور دوسری طرف پرانی کھڑی بولی بولی جاتی تھیں۔ چونکہ کسی قدیم زمانہ میں مشرقی پنجابی خود انہیں دونوں بولیوں کے زیرِ اثر

---

[1] دیکھیے نقوشِ سلیمانی۔

پیدا ہوئی تھی۔ اس لئے پنجابی بولنے والوں کو برج بھاشا کی نسبت کھڑی بولی اور ہریانی اپنے سے زیادہ قریب دکھائی دی۔ انہوں نے اس کی صوتیات اور صرف ونحو کو پنجابی سے ملتا جلتا پایا۔ اس طرح ان کی نظر انتخاب (غیر شعوری طور پر) برج کی بجائے انہیں بولیوں پر پڑی جسے وہ بہت جلد بولنا سیکھ گئے۔ اور جس کی ابتدائی شکل کو انہوں نے اپنے پنجابی لب ولہجہ اور محاورے سے متاثر بھی کیا۔ اردو کی تہ میں جو بنیادی بولی ہے اس کا تعلق تو نواح دہلی ہی سے ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ سلاطین دہلی کے عہد میں اس پر پنجاب کی زبان کا گہرا اثر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے دو تین صدیوں تک اس کا اپنا گینڈا متعین نہ ہو سکا۔ اسی خام اور غیر متعین زبان کو مسلمان دکن لے گئے تھے۔ جہاں کچھ عرصے بعد اجنبی ماحول میں اس کا اپنا معیار قائم ہو جاتا ہے۔

شہر دہلی کے جغرافیائی محل وقوع پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ یہ شہر برج بھاشا ہریانی کھڑی بولی اور میواتی (راجستھانی کی ایک بولی) کے سنگم پر واقع ہے۔ راجپوتوں کی دِلی 'دِلّی' یا اپ بھرنش ادبیات کی "ڈھلی" ہریانہ کے علاقے میں تھی۔ جس سے کھڑی بولی کی بہ نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔ شاہجہاں کی دہلی (خسرو کا اندرپٹ (اندر پرست) کئی میل ہٹ کر شمال میں بسائی گئی تھی جس کی آبادی بیشتر آگرہ کے نووارد برج بولنے والوں کی تھی۔ پنجابی مغربی ہندی کی بولیوں میں چونکہ ہریانی سے قریب تر ہے اس لئے قدیم اردو اور دکنی سے مماثلث رکھتی ہے۔ بعد کو مغلوں کے عہد میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات اس پر غالب آجاتے ہیں۔ اور اردو کا پنجابی پن زائل ہونا شروع ہوتا ہے۔ لب ولہجہ بدلتا ہے۔ اور ہندوستانی

کا اپنا معیار اس وقت قائم ہوتا ہے۔ جب وہ ایک طرف (بدل، ۔ لٹا ، اور گدّی۔ (ہریانہ، میرٹھ، سہارن پور) کی بجائے 'بادل'، 'لوٹا'، 'گاڑی' کو قبول کرتی ہے۔ اور دوسری طرف جوری۔ لری۔ لرائی۔ (آگرہ متھرا) کی بجائے جوڑی۔ لڑی۔ اور لڑائی کو۔

(۲) سلاطین دہلی کے عہد سے لیکر اورنگ زیب کے عہد تک (۱۷۰۰ء تک)

بعض مستند نمونوں کا لسانیاتی جائزہ۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے ارتقا کے اعتبار سے پانچ چھ سو سال کا یہ زمانہ جتنا اہم ہے ادبی پیداوار کے لحاظ سے یہ اتنا ہی بنجر ہے۔ سولھویں صدی عیسوی سے قبل کے ادبی نمونے شمالی ہند کی کسی بولی میں نہیں ملتے۔ اردو اس اعتبار سے بہت ہی بیچاری ہے۔ ۱۲۰۰ء تا ۱۶۵۰ء تک ادبی نمونوں کے فقدان کی وجہ سے اس کی مسلسل تاریخ نہیں لکھی جا سکتی۔ شمالی ہند میں اس کے ارتقا کا اندازہ لگانے کے لئے صرف حسب ذیل مواد ملتا ہے۔

(۱) صوفیائے کرام کے وہ اقوال اور فقرے جو مختلف تذکروں میں جا بجا بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ اور جو نہایت تحقیق کے ساتھ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی تصنیف "اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" میں جمع کر دیئے ہیں۔ اس سلسلے میں اردو کے بعض فقرے جو ہمیں شیخ حمید الدین ناگوری (۱۱۹۳ء تا ۱۲۷۴ء) کے ملفوظات "سرور الصدور" اور حضرت روشن چراغ دہلوی (متوفی ۱۳۵۶ء)

کی تصنیف "خیر المجالس"[۱] میں دستیاب ہوئے ہیں اضافہ کر دیئے گئے ہیں۔

(۲) حضرت امیر خسروؒ کی ہندی شاعری (جو مسلمہ طور پر مشتبہ ہے اور جس کی سند پیش کرتے وقت یہ خیال رکھنا ضروری ہے)۔

(۳) اس عہد کی فارسی تاریخوں مثلاً "تاریخ فیروز شاہی، تاریخ داؤدی، تاریخ ہمایونی، توزک جہانگیری وغیرہ) سفرناموں اور لغات (مؤید الفضلاء ۱۵۱۸ء) کے فقروں اور الفاظ کا جائزہ۔

(۴) لیکن اس عہد کی کھڑی بولی پورے طور سے ہندی ادبیات میں نکھرتی ہے۔ پنجابی برج بھاشا اور اودھی کے ساتھ ساتھ وہ بھی (۱) نام دیو (۲) کبیر داس اور (۳) گرونانک کی ملی جلی زبان میں روحِ عصر کی ترجمان بن رہی تھی۔

ہمارے خیال میں لسانیاتی مطالعہ کے لئے سب سے مستند مواد انہیں بھگتوں کی شاعری میں مل جائے گا کیونکہ صوفیائے کرام کے اقوال مستند بھی کر تسلیم کر لئے جائیں، تب بھی انہیں بنیاد مان کر اس عہد کی زبان کے متعلق کلیے نہیں بنائے جا سکتے۔ اس کے کئی وجوہ ہیں۔ دہلی سماج کے مختلف طبقوں میں مختلف قسم کے لسانی اثرات کارفرما تھے۔ دربار اور شاہی محلات میں ترکی اور فارسی کا دَور دَورہ تھا۔ جیسا کہ حضرت امیر خسرو کی تحریروں سے ظاہر ہے۔[۲]

ہندوستانی زبانوں میں بعد کو برج بھاشا کو امتیازی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

---

[۱] قلمی نسخہ "خیر المجالس" اور "سیر الاولیا" کے الفاظ اور فقروں کے لئے ہم خلیق احمد نظامی صاحب (شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی) کے ممنون ہیں۔

[۲] مثنوی نُہ سپہر: ترجمہ ایلیٹ اینڈ ڈسن: ص ۵۶۲

سنگیت کے سہارے وہ کھڑی بولی اور پنجابی کے علاقوں تک میں گھر کیے ہوئے تھی۔ اس لئے سماج کا ایک خاص طبقہ اس کو سیکھنے پر مائل تھا۔ گوالیر کے چاتران "کی بولی (جس کا حوالہ وجہی نے سب رس میں بار بار دیا ہے) کے اثرات سے دکن تک نہ بچ سکا تھا۔ ہم کو معلوم ہے کہ سلطان المشائخ (۱۲۳۶ء تا ۱۳۲۴ء) کے زمانے میں فارسی کے ساتھ ساتھ "ہندوی" زبان میں بھی قوالیاں گائی جاتی تھیں[1]۔ یہ قوالیاں بہت ممکن ہے برج میں لکھی جاتی ہوں۔ کیونکہ وہی سنگیت کی زبان رہی ہے لیکن بازار اور لشکر میں نہ تو ترکی فارسی کو دخل حاصل تھا اور نہ برج بھاشا کو۔ سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں چونکہ فوج میں پنجابیوں کی کثیر تعداد تھی اس لئے سرزمین پنجاب کے لسانی اثرات حاوی تھے۔ لیکن بہت جلد بازار کی زبان فوج پر حاوی آگئی۔ جہاں تک بازار کی زبان کا تعلق ہے تحقیق سے کہا جا سکتا ہے کہ اس پر دہلی کے جمنا پار والے مضافات کا اثر غالب رہا ہے[2]۔ صوفیائے کرام کا عام طور سے متوسط طبقہ ہی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ جس کی تصدیق ان اقوال سے ہوتی ہے جو ان صوفیاء سے منسوب کیے جاتے ہیں۔

لسانیاتی نقطۂ نظر سے حضرت امیر خسرو سے پہلے صرف بابا فرید شکر گنج (۱۱۷۳ء تا ۱۲۶۶ء) کے بعض اقوال اور نظمیں اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے بعض پنجابی کے دوہے بھی منسوب ہیں۔ جو آدگرنتھ صاحب[3] میں ملتے ہیں۔ لیکن ان تمام نظموں اور دوہوں کے مستند ہونے میں کافی شبہ کی گنجائش ہے جیسا کہ پروفیسر بلدیو سنگھ نے اپنے ایک

---

[1] "خیر المجالس" و سیر الاولیاء: شیخ نظام الدین اولیا کے بارے میں مصنف رقم طراز ہے
"از ہر جنس قوالان کامل بہ پارسی و ہندی گوے بخدمت او حاضر بودند"

[2] پروفیسر ٹرول بلوک: بیلٹن اسکول اورینٹل اسٹڈیز جلد ۵ - ۱۹۲۸ء

[3] گرو گرنتھ آد: نولکشور پریس (اردو ایڈیشن)

مضمون میں حضرت شکر گنج سے متعلق بہت سی غلط بیانیوں کو رفع کیا ہے۔ عام طور سے گرو نانک کے ہم عصر شیخ فرید اور شیخ فرید الدین شکر گنج دونوں کو خلط ملط کر دیا گیا ہے۔[1] جو اشعار حضرت سے منسوب کیے گئے ہیں (دیکھیے صوفیائے کرام کا کام، عبد الحق) ان کی زبان برخلاف ان اشلوکوں کے جو گرو گرنتھ آدمیں ملتے ہیں دہلی کے مضافات کی قدیم بولی کی شکل لیے ہوئے ہیں۔

اسماء: مسیت (مسجد، ہریانہ کے علاقہ میں عام طور سے ملتا ہے)

بہو (بہت، بوکڑواں (بکرے، دکنی میں بھی ملتا ہے)

چاند:

ضمائر: میں، توں، میں

افعال: لانا، لگانا: پنجابی اور ہریانی دونوں میں ملتا ہے، ہریانی میں ہائے زائدہ کے ساتھ ع تمامی تن بدن میں آگ لاہی۔

(افضل: نمونہ پنجاب میں اُردو)

ہے، ہوتے۔ پائیں۔ ہو جائیں۔ ملتا۔ تھا۔ اور آوتا۔ پاؤتا بھی ہریانی کے طرز پر ملتے ہیں۔

حروف: کو۔ ستی (سے)۔ سوں (دکنی میں عام مستعمل) اور کا۔

(دونوں کا چاند بھی بالا ہے)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پنجابی کے مسلمہ حرف "دا" کی بجائے حضرت

---

[1] اورینٹل کالج میگزین، فروری ۱۹۴۱ء

نے "کا" استعمال کیا ہے۔ جو ایک طرف پنجابی اور دوسری طرف برج بھاشا کے "کو" سے بالکل ممیز کیا جا سکتا ہے اور اس سے ہندوستانی (کھڑی بولی) کی قدامت مسلّم ہوتی ہے۔ گرد گرنتھ آدمیں بھی دلا۔ دی۔ دے۔ کے ساتھ ساتھ کا۔ کی۔ کے ملتے ہیں۔ بعض اوقات ایک ہی صفحے پر۔

لیکن پنجاب میں رہ کر اتنی صاف "دہلوی" میں گفتگو کرنا اور اشعار لکھنا کوئی بہت زیادہ تعجب کی بات نہیں۔ جیسا کہ اپ بھرنش کے باب میں بالتفصیل لکھا جا چکا ہے ناتھ پنتھی جوگیوں کے ذریعے دہلی کے آس پاس کی زبان قدیم زمانے سے مذہبی اور تبلیغی کاموں کے لئے شمالی ہند کے ہر حصے میں استعمال کی جاتی تھی۔ موجودہ پنجابی سے متعلق ایک اہم غلط فہمی رفع ہو جائے اگر اس لسانی حقیقت کو نظر انداز نہ کیا جائے کہ یہ ایک "ملواں" زبان ہے جو دوآبہ کی بولیوں کے زیر اثر بہت بعد کو ظہور پذیر ہوتی ہے۔ اور جس کے مقابلہ میں متھرا، دہلی اور ہریانہ علاقوں کی بولیاں زیادہ قدیم ہیں۔ یہ بڑی دلچسپ حقیقت ہے۔ کہ قدیم اُردو کی جن خصوصیات کو پنجابی سے منسوب کیا جاتا ہے وہ دراصل اس قدیم زبان کی خصوصیات ہیں جسے ہم اپ بھرنش کی جدید شکل کہہ سکتے ہیں اور جو کسی زمانے میں راجپوتوں کے سیاسی اقتدار کے تحت شمالی ہند کی مسلّمہ ادبی زبان بن گئی تھی اور جس سے شمالی ہند کی تقریباً تمام بولیوں نے خوشہ چینی کی ہے۔ قدیم زمانہ سے پنجاب کے کم از کم صوفی اور فقرا اس بولی سے نا آشنا نہیں تھے۔ وہ اپنے یہاں کی مقامی بولی اور اس عام فہم وسیع زبان کے اختلاف سے بخوبی واقف تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ کسے کس موقعہ پر استعمال کرنا چاہیئے۔

بابا فرید شکر گنج کے مذکورہ بالا ہندی اقوال اور جملے

سیر الاولیا[۱] سے لئے گئے ہیں جو مطبوعہ ہے۔ اسی عہد کا ایک اہم قلمی نسخہ شیخ حمید الدین ناگوری (۱۱۹۳ء تا ۱۲۷۴ء) کے ملفوظات پر مشتمل سرور الصدور[۲] کا ہے۔ جس کا سنہ تصنیف ۱۳۲۶ء ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عربی فارسی اور ہندی تینوں میں شعر کہتے تھے اردو کے نقطہ نظر سے اس میں حسب ذیل مواد ملتا ہے۔ (۱) الفاظ: کھٹ (کھاٹ)۔ پھلکہ اور بھائی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ فارسی کی عبارت میں ہر جگہ 'برادر' کی بجائے 'بھائی' کا لفظ ملتا ہے۔

(۲) جملہ: "فرمودہ است کہ عزیز" بھلو ہوئیں' بر و مت ہوئیں' سب کو پیار دہوئیں" ص ۱۷

ناگور اجمیر کے قریب راجستھانی زبان کے علاقے میں واقع ہے۔ واضح طور پر یہ جملہ راجستھانی کا جملہ ہے۔ اور اس میں اور بابا فرید شکر گنج کی زبان میں بین فرق ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صوفیا کسی عالم گیر زبان کی بجائے مقامی بولیوں کو استعمال کرتے تھے

اس کے بعد ہم حضرت امیر خسروؒ (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) کی ہندی شاعری کا ذکر کریں گے۔ جو اردو ہندی کے مسلمہ طور پر پہلے شاعر مانے جاتے ہیں۔ لیکن جن کے ہندی کلام کی کوئی سند اب تک حاصل نہیں ہو سکی ہے۔ خسروؒ کے صاحب دیوان ہندی شاعر ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ کہ وہ فارسی' ترکی اور عربی کے ساتھ ہندی زبان کے بھی ماہر تھے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ ان کی ہندی دانی کے ثبوت میں

---

[۱] شائع کردہ چرنجی لال: مطبوعہ محب ہند دہلی

[۲] نقل قلمی نسخہ مملوکہ خلیق احمد نظامی صاحب شعبہ تاریخ' مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ۔

ان کی فارسی مثنوی "دولرانی خضر خاں" کا یہ اقتباس کافی ہوگا

غلط کردم گراز دانش زنی دم | نہ لفظ ہندی ست از پارسی کم
بجز تازی کہ میر ہر زباں ست | کہ بر جملہ زبانہا کامراں ست
دگر غالب زبانہا در رے دردم | کم از ہندی ست شد زندیشہ معلوم
عرب در گفت دارد کارِ دیگر | کہ نامیزد در دگفتار دیگر
بنقصانست لفظ پارس در خورد | کہ بے آچار تیزی کم تواں خورد
چو آں صافی وش واں دردناک است | توگوئی کیں جسد واں جان پاک است
جسد را مایہ گنجد زہر ساں | نہ گنجد از لطافت ہیچ در جاں
نہ زیبد جفت کردن ہمسری را | عقیقے از یمن درّ دری را
ہمیں دولت زگنج خویش صرف است | متاع عاریت عاری شگرف است
زبانِ ہند ہم تازی مثال است | کہ آمیزش درآں جا کم مجال است

مذکورہ بالا اقتباس جہاں خسروؔ کی زبان دانی پر صاد ہے اس بات پر بھی روشنی ڈالتا ہے کہ اُس وقت تک کم از کم ادبی حلقوں میں ریختہ (آمیختہ زبان) کا کوئی تصوّر نہ تھا۔

آگے چل کر ہندی کے صرف و نحو کے متعلق لکھتے وقت اس نکتے کو واضح طور سے بیان کرتے ہیں :-

گر آئین عرب نحوست دگر صرف | ازاں آئیں دریں کم نیست یک حرف
کسے کیں ہر سہ دکّاں راست صراف | شناسد کیں نہ تخلیط ونے لاف

۱؎ مرتبہ رشید احمد سالم : مطبع انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ : ص۱۰۱ تا ۱۲۰

معانی ومفہوم کے متعلق لکھتے ہیں :-

دگر پرسی نیائش از معانی | در آں نیز از دگر جا کم نہ دانی
اگر از صدق وانصافت دہم شرح | حدی ہندی کنی گفتار من جرح
در آرایم بہ سوگندے زبانے | کہ داند یا ورم داری زبانے

خسروؔ کی ہندی شاعری سے متعلق سب سے پہلی سند ہمیں وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) میں مل سکی ہے۔ شاید خسروؔ کی ہندی شاعری کا سب سے مستند اور قدیم ماخذ یہی ہے۔ حسب ذیل دوہرہ وجہی نے نقل کیا ہے۔

پنکھا ہو کر میں ڈلی ساتی تیرا چاؤ
منجہ جلتی جنم گیا تیرے لیکھن باؤ[1]

اس کے بعد میر تقی میر کے تذکرہ نکات الشعرا میں ان کا یہ ریختہ ملتا ہے :-

زرگر پسرے چو ماہ پارا
کچھ گھڑیئے ۔ سنواریئے پکارا
نقد دلِ من گرفت و بشکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

حضرت امیر نے پرتھوی راج کے قتل کے ۹۰ برس بعد شاعری شروع کی۔ راجپوتی عہد کی زبان کا روپ پچھلے صفحات میں دکھایا جا چکا ہے۔ ۹۰ برس کے اندر زبان کا یہ الٹ پھیر جو خسروؔ کی ہندی شاعری سے ثابت ہے سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ امر یقینی ہے کہ پرتھوی راج کے عہد کی ادبی ہندی مسلمانی عہد کی ادبی ہندی سے ضرور مختلف ہوگی لیکن اس قدر بھی نہیں۔ جتنی کہ خسروؔ کے ریختوں پہیلیوں اور مکرنیوں سے

---

[1] سب رس ص ۲۱۸

ظاہر ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلم سماج سے تعلق رکھنے کی وجہ سے خسروؒ نے اپنی پہیلیوں اور مکرنیوں کے لئے زبان کی عام پسند شکل کو اپنایا ہوگا یعنی وہ زبان جو عام طور سے دہلی کے گھرانوں میں اس وقت رائج تھی لیکن تعجب تو یہ ہے کہ ان کی زبان کہیں سے بھی پرانے پن کا سراغ نہیں دیتی۔ اس پر آپ بھرنشی لسانی روایات کا اتنا بھی آب و رنگ نہیں جتنا کہ ہمیں دکنی ادبیات میں مل جاتا ہے۔

امیر خسروؒ کی زبان سے متعلق جو شبہ ہم نے ظاہر کیا ہے اس کا ثبوت ہندی کے ان فقروں سے مل جاتا ہے جو اُن کے ہم عصر اور پیر بھائی حضرت روشن چراغ دہلویؒ (متوفی ۱۳۵۶ء) کی تصنیف "خیر المجالس"[1] میں بکھرے ہوئے مل جاتے ہیں۔ اس کتاب کے ہندی فقروں کو ابھی تک کسی نے یکجا نہیں کیا ہے۔ حالانکہ امیر خسروؒ کے عہد کی زبان بالخصوص صوفیائے کرام کے حلقوں میں بولی جانے والی زبان کا ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

صفحہ ۲۱۶ پر علی مولا بدایونی حضرت نظام الدین اولیاء کے متعلق جو اس وقت سنِ بلوغ کو پہونچ چکے تھے یہ پیشین گوئی فرماتے ہیں۔

"علی مولا چوں دید آغاز کرد بہ زبان ہندوی "ارے مولانا! یہ بدا ہوسی۔ یعنی "اے مولانا ایں مرد بزرگ خواہد شد" مولانا علاء الدین گفت۔ علی از کجا می گوئی۔ گفت من درو دو چیزے می بینم۔ یک آنست کہ بزبان ہندی گفتند۔ "جو منڈا سا باندی سو پائیں پسری" یعنی آنکہ دستار بر سر بندد او در پائے کسے اُفتد"

---

[1] نسخہ قلمی مملوکہ پروفیسر محمد حبیب صاحب۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ۔

ہندی کے ان فقروں پر ہریانی زبان (دہلوی) کا کس قدر اثر غالب ہے وہ ذیل کے الفاظ سے ظاہر ہے۔

(۱) [سی] علامت مستقبل کے طور پر استعمال کی گئی ہے۔ جو قدیم دکنی میں بھی ملتی ہے۔ مثلاً

(سب رس): جس عشق کا کچھ درد اس کتاب کو پینے پرتے ہلاسی نا۔

اس کتاب بغیر اپنا وقت بھلاسی نا۔

احمد دکنی: کدھیں یچ سنگ سنگ ملسی نہ منجہ
کدھیں من کمل پھول کھل سی نہ منجہ (لیلےٰ مجنوں)

ولی: کہا ہے زہر کا تاثیر اس میں
نہ چل سی کچھ مری تدبیر اس میں (روضۃ الشہدا ص ۳۹)

پروفیسر شیرانی نے اس (سی) کا تعلق ملتانی سے بتایا ہے۔ حالانکہ مغربی ہندوستان کی اکثر زبانوں (مثلاً گجراتی۔ مارواڑی۔ جے پوری) میں یہ آج تک بعینہ استعمال ہوتی ہے۔ دہلی کے مضافات بالخصوص ضلع گوڑگاؤں کی بولیوں میں بھی یہ پائی جاتی ہے جہاں سے یہ قدیم دہلی کے بازاروں میں عام طور سے رائج ہو گئی ہو گی صوفیائے کرام کا تعلق چونکہ عام طور سے عوام سے تھا اس لئے ان کے زبان کے اثرات کا قبول کرنا ناگزیر تھا۔

(۲) لفظ بدا (بڈا بمعنی بڑا) آج بھی ہریانہ اور کھڑی بولی کے اضلاع میں اسی تلفظ کے ساتھ بولنے میں آتا ہے۔ [ڑ] اور [ڑھ] کی آوازیں در اصل مابعد کا ارتقا ہیں۔ ۱۶۰۰ء تک ان آوازوں نے ہریانہ اور دوآبہ کے علاقوں

میں جڑ نہیں پکڑی تھی۔ پنجابی میں قدیم زمانہ سے 'بڈا' کو 'وڈا' کہتے آئے ہیں۔ پنجابی میں مرہٹی کی طرح عام طور سے [ب] اور [د] آوازوں میں امتیاز برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس دہلی کے آس پاس کی بولیوں میں (د) عام طور سے (ب) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس اعتبار سے دکنی پنجابی زبان کی پیروی نہیں کرتی۔

اُردو کا ایک اور فقرہ "خیر المجالس" میں صفحہ ۱۱۲ پر ملتا ہے۔

"فرمودند کہ در عہد موسیٰؑ بت پرستے بود۔ رونہے اور تپ آمد۔ بر سر پائے بت سر نہاد و گفت "تو میرا گسائیں تو میرا کرتا د۔ مجھ اس تاپ تھیں چھڈا۔" ہیچ جوابے نیامد۔ گفت "تو کرتار نہیں"۔

اس فقرے میں الفاظ تھیں (سے)، اور چھڈا (چھڑا) ہریانی زبان کی قدامت کو مسلمہ طور سے ثابت کرتے ہیں۔ تھیں (ق۔ق صفحہ ۲۳۲) دکنی میں برابر مستعمل رہا ہے۔ مجھے کی جگہ مجھ کا استعمال حالت فاعلی کی قدامت پر صاد کرتا ہے۔

خیر المجالس کے گنے چنے ہندی فقروں سے جس زبان کے کینڈے کا پتہ چلتا ہے۔ خسروؔ کی ہندی شاعری میں وہ میلان نہیں ملتا۔ ان کے یہاں سی علامت مستقبل کے طور پر ایک جگہ بھی استعمال نہیں ہوئی ہے۔ خسروؔ سے منسوب جو پہیلیاں اور مکرنیاں ہیں ان کی زبان کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں تین قسم کی زبان ملتی ہے (۱) ٹھیٹھ کھڑی بولی (۲) کھڑی اور برج بھاشا ملی ہوئی (۳) خالص برج بھاشا۔ پہیلیاں وغیرہ عام طور سے کھڑی بولی یا پھر کھڑی اور برج بھاشا ملی ہوئی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ لیکن ان کے گیت عام طور سے معیاری برج بھاشا میں ہیں۔ اس سے خسروؔ کو کبیر کی طرح مفر نہ تھا۔ گیت برج بھاشا سے مخصوص ہو چکا تھا۔ آج بھی ادبی ہندی اور اُردو لکھنے والے جب گیت لکھنے بیٹھتے

ہیں تو سورداس جی کی زبان قلم سے ٹپک پڑتی ہے۔

(الف) ٹھیٹھ کھڑی بولی۔

(۱) ایک تھال موتی سے بھرا　　سب کے سر پر اوندھا دھرا
چاروں اُور وہ تھال پھرے　　موتی اُس سے ایک نہ گرے

(۲) آوے تو اندھیری لا دے　　جاوے تو سب سُکھ لیجاوے
کیا جانوں وہ کیسا ہے　　جیسا دیکھا ویسا ہے

(۳) بات کی بات ٹھٹھولی کی ٹھٹھولی　　مرد کی گانٹھ عورت نے کھولی

(۴) ایک کہانی میں کہوں تو سُن لے میرے پوت
بنا پروں وہ اُڑ گیا باندھ گلے میں سوت

(ب) خالص برج بھاشا۔

(۱) سیام برن پی تامبر کاندھے مرلی دھر نہیں ہوئے
من مرلی وہ ناد کرت ہے برلا بوجھے کوئے

(۲) سو بھا سدا بڑھاون ہارا　　آنکھن تے چھن ہوت نہ پنارا
آئے میرے من انجن　　اے سکھی ساجن نا سکھی انجن

(ج) کھڑی اور برج ملی زبان۔

ایک گنی نے یہ گن کینا　　ہریل پنجرے میں دیدینا
دیکھو جادوگر کا حال　　ڈالے ہرا نکالے لال

خسرو کی بہت سی پہیلیاں جہاں لسانیات کی رُو سے غلط ثابت ہو چکی ہیں، وہاں اکثر ایسی بھی ہیں جو تاریخی صداقت سے عاری ہیں۔ مثلاً حقہ والی

پہیلی ہی کو لیجئے[1]۔ ہندوستان میں تمباکو کا رواج جہانگیر کے زمانہ میں ہوا تھا۔ تمباکو کی سب سے پہلی کوٹھی انگریزوں نے اسی بادشاہ کے عہد میں شہر سورت میں قائم کی تھی جس کی نسبت سے آج تک پورب میں تمباکو کو 'سورتی' یا 'سُرتی' کہتے ہیں۔ خالق باری کے متعلق تو اب یہ یقینی ہے کہ یہ حضرت امیر خسرو کی تصنیف نہیں[2]۔ بلکہ عہد جہانگیر کے ایک بزرگ ضیاء الدین خسرو نے اسے ۱۶۲۱ء میں مبتدیوں کے لئے منظوم لغت کے طور پر تصنیف کیا تھا۔ اور مشاہیر میں سب سے پہلے خان آرزو نے اپنی لغت نوادر الالفاظ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔ اور اسے امیر خسرو کا رسالہ کہا ہے۔ لسانی تجزیہ کرنے کے بعد بھی ہم اِسی نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ خسرو کے ہندی کلام کی زبان عالم گیر کے عہد سے قبل کی اُردو نہیں۔ اِس لئے امیر کے کلام کو قدامت کی سند بخشتے وقت ذرا احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ کم از کم اِس سے ہرگز اس عہد کی زبان کے متعلق کلیات نہیں بنائے جا سکتے۔

(اُردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں سب سے مستند نقش حضرت گیسو درازؒ کی معراج العاشقین ہے جو ۱۴۱۲ء اور ۱۴۲۲ء کے درمیان کی تصنیف ہے۔ حضرت گیسو دراز کی زبان پر دکنی کا اطلاق بہ مشکل ہو سکتا ہے۔ پندرہ سال کی عمر سے لے کر اسّی سال کی عمر تک کا زمانہ انہوں نے دہلی میں بیتایا تھا۔ ان کے خاندان کا تعلق بھی دہلی سے تھا۔ اُن کے والد شاہ راجو قتال حضرت برہان الدین غریب کے ساتھ دکن گئے تھے۔

---

[1] پہیلی یہ ہے۔ ۔ گاگر تیری جل بھری، سر پر لاگی آگ
باجن لاگی بانسری، نکِن لاگی آگ

[2] دیکھئے خالق باری مرتبہ پروفیسر شیرانی : انجمن ترقی اُردو۔ ۱۹۴۴

اس وقت حضرت گیسو دراز کی عمر پانچ سال کی تھی۔ ان واقعات کی سند پر ہم حضرت گیسو دراز کی زبان کے متعلق یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ وہ چودھویں صدی عیسوی کی "زبانِ دہلوی" کی نشان دہی کرتی ہے۔ معراج العاشقین کے لسانیاتی جائزہ کا ماحصل یہ ہے۔

کاڑا (جو شاندہ)۔ زرگن۔ مائی۔ ہور (اور۔ یہ پنجابی اور کھڑی تک میں ملتا ہے) نک (ناک)۔ یارا (ہوا) پیلانا (پلانا) لگ (تک) بوی (بو) سوں (سے) تے (سے) کوں۔ اپس کوں (اپنے کو) آپے (خود) کیاں (جمع کی) انگے (آگے) دُسرا (دوسرا) تِسرا۔ اندھارا (اندھیرا) اجیالا۔ نیں (نہیں) لک (لاکھ) میریاں (جمع میری) رک (رکھ) لے (یہ) پینے (پہنے) باج (بغیر) دسنا (دکھائی دینا)، بیٹ (بیٹھ) ستی (سے) منا (منع) بوجے سو لوگا (علماء) پھنک (مطلق)۔

معراج العاشقین کی زبان کا مقابلہ اسی دور کے دکنی شاعر نظامی (تقریباً ۱۴۶۰ء) کی مثنوی "کدم راؤ اور پدم" کی زبان سے کیجئے۔ تو نظامی کی زبان کی قدامت مسلّم ہو جاتی ہے۔ نظامی کی زبان میں نہ صرف راجستھانی اور پنجابی کی اکثر شکلیں پائی جاتی ہیں بلکہ اس پر اَپ بھرنشی روایات کا ٹھپہ بھی صاف نظر آتا ہے۔ اس بنا پر یہ قیاس بھی کرنا پڑتا ہے کہ دکن میں نواح دہلی کی ایک سے زائد بولیوں کے اثرات پہونچے ہیں۔ مرورِ ایام سے پھر رفتہ رفتہ دکن کا اپنا محاورہ نکھرتا ہے جس کا بہترین نمونہ وجہی اور قلی قطب شاہ کی زبان میں ملتا ہے۔

"زبانِ دہلوی" (کھڑی بولی) کا ارتقاء اگر ایک طرف اُردو کی شکل میں خسرو اور دیگر صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہو رہا تھا تو دوسری طرف لشکریوں اور بیوپاریوں

اور سادھوؤں کے ذریعے یہ پنجاب دکن اور پورب کے علاقوں میں رواج پا چکی تھی جس کی شہادت ہمیں نامدیو۔ کبیرداس اور گرونانک کے کلام سے ملتی ہے۔ سلاطین دہلی کا جو لشکر بنگال سے لے کر دکن تک سیلاب کی مانند بڑھتا ہے۔ اس میں پروفیسر ڈول بلوک کے مطابق پنجابیوں سے زیادہ ہریانہ علاقہ کے جنگی اور اکھڑ لوگوں کی تعداد تھی[1]۔ سلاطین دہلی کی فوجوں میں بھرتی سب سے زیادہ اضلاعِ انبالہ، کرنال حصار اور دہلی کے جنوب میں میوات کے علاقہ سے کی جاتی تھی۔ جہاں جنگی روایات آج بھی زندہ ہیں۔ دوآبہ کے بالائی حصے اور مغربی روہیلکھنڈ کی شستہ اور "کھری" اُردو یقیناً بعد کی پیداوار ہے جس کی ساخت و پرداخت میں نووارد پٹھانوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ گریرسن نے انہیں اضلاع کی ہندوستانی (کھڑی بولی)، کو معیاری اور ادبی اُردو سے قریب تر بتایا ہے۔

دہلی کی یہ زبان لشکریوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے جن جن گوشوں میں جاتی ہے وہاں وہ ایک بلوقاریوں کی حیثیت حاصل کر لیتی ہے۔ جس طرح دکن میں اُردو ادب سب سے پہلے پروان چڑھتا ہے، شمالی ہند میں بھی زبان دہلوی ہندی شعرا نامدیو، کبیر اور گرونانک کے کلام میں ممتاز ادبی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ آئندہ سطور میں ہم اپنی زبان کے اسی ارتقا پر روشنی ڈالیں گے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ شہر دہلی اس وقت تک ہندوستانی تہذیب و تمدّن کا مرکز بن چکا تھا۔ بالخصوص سلطان المشائخ کے بعد سے تو "حضرت دہلی" یا "دہلی شریف" مرجع خاص و عام بن گئی تھی۔

---

[1] بلیٹن اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (لندن)؛ سنہ ۱۹۲۸: صفحہ ۷۲۹

مذہبی تحریکات کے اعتبار سے ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کی تاریخ نہایت دلچسپ ہے۔ بھکتی کی تحریک نے ایک عالمگیر مذہب کی داغ بیل ڈالی اور ایک ہمہ گیر زبان کے تصور کو بھی پیش کیا۔ اس عہد کے مذہبی پیشواؤں کو شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ احساس ہوگیا تھا کہ ان کا عالمگیر پیغام ایک عالمگیر زبان میں ہونا چاہیئے۔ یہی وجہ ہے کہ نامدیو نے مرہواڑی میں کبیر داس نے پورب اور گرونانک نے پنجاب میں بیٹھ کر لشکریوں اور بیوپاریوں کے ذریعے پھیلتی ہوئی اس زبان کو اپنایا جسے خسروؒ نے "زبانِ دہلوی" کے نام سے یاد کیا ہے۔ دہلی کے مرکز سے جو نئی لسانی لہریں تمام ہندوستان میں پھیل رہی تھیں ان کا عکس ہمیں دکن کے دُور دراز گوشے کے ایک شاعر نامدیو (سنہ ۱۳۲۸ء تا سنہ ۱۴۰ء) کے کلام تک میں مل جاتا ہے۔ نامدیو سنہ ۱۳۲۸ء میں مرہٹواڑی کے ضلع ستارہ میں پیدا ہوئے۔ ایک طرح سے وہ کبیر کے پیشرو تھے۔ بھکتی تحریک جس کے روحِ رواں سوامی دیانند اور ولبھ اچاریہ تھے، نامدیو جیسے بھگتوں کے ذریعے دکن میں پھولی پھلی۔ وہ مرہٹی زبان کے پہلے بڑے شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ لیکن اپنے پیغام کو عمومیت بخشنے کی خاطر اُنہوں نے کھڑی بولی میں بھی شاعری کی ہے۔ دکنی ادبیات کے سلسلے میں ابھی تک نامدیو کا ذکر کسی نے نہیں لیا ہے حالانکہ کئی لحاظ سے انہیں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ نامدیو کے زمانے ہی میں دیوگری پر پٹھانوں کی چڑھائیاں ہو چکی تھیں اور مسلمان مہاراشٹر میں پھیل چکے تھے۔ اُن سے بھی قبل گورکھ ناتھ کو ماننے والے جوگی دکن میں اپنے اڈے قائم کر چکے تھے اور اس طرح شمالی ہند کی کھڑی بولی سے دکن رُوشناس ہو چکا تھا۔

نامدیو کی ہندی شاعری میں برج بھاشا اور کھڑی بولی دونوں کے نمونے

مل جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کبھی وہ مورتی پوجا سے متعلق دوہے لکھتے ہیں تو ولبھ اچاریہ کی برج کو اختیار کرتے ہیں۔ لیکن جب وہ ایک خاص قسم کے تصوف کی تلقین کرتے ہیں تو وہ ایک ایسی ملی جلی زبان لکھتے ہیں جس میں کھڑی بولی کا جزو شامل ہوتا ہے اور جسے بعد کو کبیر داس جی نے اپنے دوہوں کے لئے مخصوص بنا دیا تھا۔ دراصل اس عہد کے تمام بھگتوں کے یہاں موضوع کے اعتبار سے زبان کا انتخاب ہوتا تھا۔ مثلاً کرشن سے متعلق جتنے بھی دوہے ملتے ہیں وہ یا تو خالص برج بھاشا میں ہوں گے یا برج سے ملی ہوئی کسی مقامی بولی میں۔ اس کے برعکس کبیر پنتھیوں نے ہمیشہ سدھکڑی زبان (مخلوط زبان) میں شاعری کرنا پسند کی ہے۔ نامدیو کے کلام سے بعض منتخب دوہے نقل کئے جاتے ہیں جن کی لسانی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

قدیم برج بھاشا کا نمونہ :-

سپھل[1] جنم موکو گرو کینا دکھ بسار[2] سکھ انتر[3] دینا
گیان دان موکو گرو دینا رام نام بن جیون ہینا[4]

قدیم کھڑی بولی کا نمونہ :-

مائی نہ ہوتی، باپ نہ ہوتے، کرم نہ ہوتا کایا
ہم نہیں ہوتے، تم نہیں ہوتے، کون کہاں تے آیا
چند نہ ہوتا، سور[5] نہ ہوتا، پانی پون[6] ملایا
شاستر نہ ہوتا، وید نہ ہوتا، کرم کہاں تے آیا

---

[1] کامیاب [2] بھلا [3] دل [4] پوچ
[5] سورج [6] ہوا

دیگر

من میری سُوئی ، تن مرا دھاگا
کھیچر[1] جی کے چرن[2] پر ناما[3] سینپی لاگا

آخری دو نمونے خالص کھڑی بولی کے ہیں۔ لیکن حرف "تے" (یعنی سے)۔ سے اس کی قدامت بھی مسلّم ہو جاتی ہے۔

کبیر داس :- (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۵ء)

یہی زمانہ کبیر داس جی کا ہے جن کے دوہوں کی زبان اس عہد کی لسانی تحریکات کی بہترین آئینہ دار ہے۔ کبیر کے کلام کے اب تک بے شمار مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں سب سے مستند کبیر گرنتھا ولی ہے جو ناگری پرچارنی سبھا نے ایک نہایت قدیم نسخے (سمبت ۱۵۶۱ء) کی سند پر شائع کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر رام کمار ورما کی رائے میں یہ نسخہ بھی مشتبہ ہے[4]۔ جس کا مدلّل ثبوت انہوں نے اپنی نئی معرکتہ الآرا تصنیف "سنت کبیر" کے دیباچہ میں دیا ہے۔ ان کے خیال میں کبیر کا تاریخی اور لسانی دونوں اعتبار سے سب سے مستند کلام گرو گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔ جسے پانچویں گرو ارجن نے ۱۶۰۴ء میں مرتب کیا۔ سکھوں کی مقدّس کتاب ہونے کی حیثیت سے اس کو مرتب کرتے وقت اس کی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے اس لئے اس کے مستند ہونے میں شبہ کم ہو سکتا ہے۔ جس وقت اُسے گرومکھی رسم الخط میں

---

[1] نام گرو کا [2] پاؤں [3] نام دیو

[4] سنت کبیر : ڈاکٹر رام کمار ورما ، صفحہ ۵

لکھا گیا ہے تو ایک ایک ماترا پر نظر رکھی گئی ہے جیسا کہ گرو گرنتھ صاحب کے ہندی ایڈیشن کے دیباچہ میں مؤلف نے اس کی تصدیق کی ہے[1]۔ اس کی مزید تصدیق کبیر کے اُن دوہوں اور اشلوکوں سے ہوتی ہے جو اس میں شامل کر دیئے گئے ہیں اور جن کا پوربی پن بڑی صحت کے ساتھ برقرار رکھا گیا ہے۔ ڈاکٹر رام کمار ورما کی "سنت کبیر" گرو گرنتھ صاحب ہی پر مبنی ہے۔ کبیر داس نے اپنی زبان کے متعلق خود کہا ہے ؎

میری بولی پوربی تا ہے نہ چینہے کوئے   میری بولی سو لکھے جو پورب کا ہوئے

(میری بولی پوربی ہے اسے کوئی نہیں جانتا۔ میری بولی صرف پوربی جان سکتا ہے)

جس سے صاف ظاہر ہے کہ وہ پوربی بولی میں لکھتے تھے کیوں کہ وہ خود پورب (بنارس) کے رہنے والے تھے۔ بنارس اور اُس کے نواح میں بھوجپوری اور اودھی بولیاں رائج ہیں۔ لیکن کبیر کی پوربی تلسی داس اور جائسی کی پوربی بولی سے مختلف ہے۔ انھوں نے عمر کا بہت بڑا حصہ تیرتھ یاترا میں گزارا تھا۔ اپنی اس سیلانی زندگی میں انھیں جگہ جگہ اس نئی زبان سے سابقہ پڑا جو ایک عالمگیر زبان کی حیثیت سے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پھیل چکی تھی۔ اور جو میلوں ٹھیلوں میں مختلف زبان بولنے والوں کا واحد ذریعۂ گفتگو تھی۔ اسی لئے کبیر کے کلام میں بھی (بالخصوص ساکھی کے دوہوں میں) ایک ملی جلی زبان ملتی ہے جس سے کھڑی بولی، راجستھانی اور پنجابی تک کے اثرات جھلکتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کبیر کی زبان عام طور سے پوربی بولی کی قواعد کی پابندی کرتی ہے۔ مثلاً انھوں نے ہمیشہ پوربی بولی کے ضمائر استعمال کئے ہیں[2]۔

---

[1] آدگرنتھ صاحب: موہن سنگھ ویدیہ تَرن تاری (امرتسر)

[2] سنت کبیر: دیباچہ

تے ۔ تُم ۔ تے ۔ تن وغیرہ

دیگر حروف بھی ؛۔

کَو ۔ سیَو ۔ سَو ۔ رے ۔

تاکَو ۔ کے ۔ جاکے ۔ میں ۔ ہی ۔ کہیں کہیں کھڑی اور برج بھاشا کے حرف بھی مل جاتے ہیں ۔ لیکن پنجابی کے نوں ۔ میں ۔ توں ۔ دا ۔ وِچ وغیرہ کسی صفحے پر نہیں ملتے ۔

افعال میں کبیر نے بڑی آزادی سے کام لیا ہے ۔ بیک وقت کھڑی' برج اور اودھی کی شکلیں مل جاتی ہیں ۔ اُودھی میں فعل کے آخر میں (یا) کی بجائے عام طور سے (دا) آتا ہے ۔ کبیر نے زیادہ تر (دا) ہی استعمال کیا ہے ۔ مثلاً ؎

اُر دجے تھا کو سم رٹس پاوا

اکہہ کہا کہی کا سمجھا وا[1]

زمانۂ حال' ماضی اور مستقبل میں بھی یہی آزادی برتی گئی ہے "کرہی" کے ساتھ ساتھ "کرہی" "بھرہی" بھی مِل جاتے ہیں ۔ ماضی عام طور سے اُودھی کا استعمال کیا ہے ۔ مستقبل میں اُودھی کی علامت (ب) کو برقرار رکھا ہے ۔ مثلاً

ماری بو ۔ چڑھی بو ۔ جیبوُ ۔ آئے بو ۔

ع اوچھے تب کری بہوری نہ آئے بو

لیکن اس کے ساتھ ساتھ کھڑی کی علامت مستقبل (گا) بھی مل جاتی ہے ۔

ع ۔ انت کی بار لہے گی نہ آڑھے

لیکن پنجابی کی (اسے) ۔ (سی) اور (ہوسے گا) وغیرہ کی شکل نہیں ملتی ۔ البتہ

---

[1] سنت کبیر : دیباچہ

ماضی مطلق کی بعض شکلیں کبیر کے یہاں ایسی مل جاتی ہیں جو ڈاکٹر ورما نے پنجابی سے منسوب کی ہیں۔ مثلاً جانیا۔ مانیا۔ پائیا۔ بجھائیا وغیرہ۔ لیکن یہ شکلیں پنجابی سے مخصوص نہیں۔ یہ ہریانہ اور انبالہ کے دیہاتی رقبوں میں آج بھی سننے میں آتی ہیں۔ قدیم دکنی میں چلیا۔ رہیا وغیرہ عام طور سے مستعمل تھے جو قدیم دہلوی سے تعلق رکھتے ہیں نہ کہ پنجابی سے۔

مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ کبیر داس نے پوربی ہی میں شاعری کی ہے۔ لیکن چونکہ زبانِ دہلوی (کھڑی بولی) اس وقت مسلم سماج کے علاوہ ہندو سماج پر بھی اپنا سکہ جما چکی تھی اور اس کے اثرات دکن، پورب اور پنجاب میں یکساں طور پر پھیل چکے تھے ان علاقوں کے رہنے والے شاعر (بالخصوص نرگن پنتھی، صوفی) جو تصورات اور زبان کے اعتبار سے اپنے کو قدیم روایات سے آزاد سمجھتے تھے) اپنے کلام کو قبول عام کی سند بخشنے کی خاطر اس میں مروّجہ زبان کا پٹ ضرور شامل کر دیتے تھے۔ از منۂ وسطیٰ کا یہ لسانی ارتقا اس کے عام مذہبی میلانات کے عین مطابق تھا۔ ہندستان کی بولیوں کی کثرت کے درمیان لسانی وحدت کا ایک نیا نقش رفتہ رفتہ اُبھر رہا تھا جس کا دھندلا سا خاکہ ذیل کے اقتباسات میں مل جائے گا۔

کبیر کی کھڑی بولی۔

(۱) کبیر کہتا جات ہوں سُنتا ہے سب کوئے
رام کہے بھلا ہوئے گا۔ نہیں تر بھلا نہوئے

ؔ سنت کبیر: دیباچہ

ؔ " "

(۲) آؤں گا نہ جاؤں گا مروں گا نہ جیوؤں گا
گرو کے سبد رم رم رہوں گا!

(۳) کبیر من نرمل بھیا، جیسا گنگا نیر
شلوک بھگت کبیر (گرو گرنتھ آوے[۱])

کبیر لوٹنا ہے تو لوٹ لے رام نام ہے لوٹ
پھر پاچھے پچھتا ہو گے پران جائیں گے چھوٹ
کبیر میرا مجھ میں کچھ نہیں جو کچھ ہے سو تیرا
تیرا تجھ کو سونپے کیا لاگے میرا

قدیم ہریانی اور برج کی جھلک۔

ع۔ کبیر کوڑی کوڑی جوڑ کے جوڑے لاکھ کروڑ
ع۔ کبیر ہر کا سمرن چھاڈ کے پالیو بہت کٹنب

اشلوک نمبر ۱۰۴ اور نمبر ۱۲۲ میں "ڈوبے" کی بجائے "ڈبے" اور "سے" کی بجائے "سیتی" (یہ حرف ربط قلی قطب سے کر ولی اور حاتم تک اردو ادب میں ملتا ہے) بھی ملتے ہیں۔

اردو زبان کی تشکیل کا دوسرا پہلو یعنی ہندوستانی زبانوں میں فارسی عربی الفاظ کی آمیزش کا رجحان کبیر کے زمانے میں اپنے شباب کو پہونچ چکا تھا۔ کبیر کے کلام سے ہم ذیل کے فارسی عربی الفاظ جمع کر سکتے ہیں۔

اندا جا۔ آجائیں (عذاب) اِکھلاس (اخلاص) اپھترا (افترا) اکتیار (اختیار)

---

[۱] اردو ایڈیشن نول کشور پریس۔

اُجو (وضو) کتیب (کتاب: قرآن) کرم (کرم)۔ کریم۔ کاجی (قاضی) کلف (قفل)، کھلک (خلق)، کھسم (خصم) ترکیت (طریقت) دگائی (دا غنے سے) دکھتر (دفتر)، دمامہ۔ درگاہ۔ درحال۔ دروگ (دروغ)۔ جرد رو (زرد رو) دست گیری۔ دُنی (دُنیا)، ودجک (دوزخ) نوبت۔ نار۔ نی بگ (نی بخت: کم بخت)۔ نسانہ (نشان) پروردگار۔ پریشانی۔ پلیتہ (پلید) پلیتیا (فلیتہ) پاکم پاک (بالکل پاک)۔ پاساری (پاسدار) پُرجا پرُجا (پُرزے پرُزے) پیگامبر (پیغامبر) پھرمان (فرمان) پھکر (فکر) پھرمائی (فرمائی) بندگی۔ بندہ۔ بکھسی (بخشش)، برکس (برکت) بیدار۔ بھستی (بہشت) مجلس۔ مردن (جمع مرد) مسکین۔ مسیت (مسجد: قدیم زمانہ میں اسے "مسیت" کہتے تھے۔ حضرت شکر گنج کے اقوال میں بھی یہ لفظ اِسی طرح ملتا ہے۔ میانے (درمیان) میرحمت (مرحمت) ملاں (مُلّا) رباب۔ رحمانا (رحمٰن) رجم (رجعت) روجا۔ صدر۔ صبوری۔ سلار (سالار) سہوہ (سہو)۔ ثابت۔ ستاب (شتاب)۔ سہر (شہر)۔ سنت۔ سیکھ (شیخ) حک (حق) حجری (حضوری)۔ ملاں۔ ہوائی۔ حال۔ گور۔

غرضکہ کبیر کے یہاں شیرانی کے بقول دس فی صدی تو نہیں لیکن پانچ فی صدی فارسی عربی کے الفاظ ضرور مل جائیں گے۔ بلکہ فارسی کے اکثر محاورے جو اُردو کے ذریعے رائج ہو گئے تھے اُن کے کلام میں مل جاتے ہیں۔

نوبت زدن: ع کبیر نوبت آپنی دس دن لیہو بجائے

تیشہ برپا زدن: ع پانوں کلہاڑی ماریا مورکھ اپنے ہاتھ

پندرھویں صدی کی ہندوستانی کی سب سے مستند شکل ہمیں کبیر ہی کے کلام میں ملتی ہے۔ یہ ایک طرح سے "پنجابی۔ ہندوستانی۔ برج" ایک مرکب زبان تھی جو صحیح معنوں میں

شورسینی اپ بھرنش کی جانشین تھی۔ بعد کو برج شعر کے لئے مخصوص ہوگئی۔ عمومیت ہندستانی (کھڑی بولی) ہی کو حاصل ہوئی جس پر عرصے تک نوارد پنجابی مسلمانوں کی زبان کا اثر بھی رہا۔ کبیر کی شاعری میں ہندوستانی زبان کے ادبی امکانات کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ ان کے دوہے پورب سے لے کر پنجاب تک عام مقبول تھے جس کا ثبوت گرو گرنتھ صاحب، سکھوں کی مقدس کتاب ہے جس میں کبیر کے کلام کو بڑی صحت کے ساتھ محفوظ کردیا گیا ہے۔

گرو نانک : (۱۴۶۹ء تا ۱۵۳۹ء)

"زبانِ دہلوی" پورب اور دکن کے علاوہ پنجاب میں بھی اپنا گھر کر رہی تھی۔ اس کا بیّن ثبوت گرو نانک کے کلام کا وہ حصّہ ہے جس میں پنجابی کے ساتھ ساتھ اس زمانے کی مقبول عام زبان کے الفاظ اور تراکیب کی بہتات ملتی ہے۔ پنجاب عرصہ تک ناتھ پنتھی جوگیوں کا اڈّا رہا ہے اس طرح وہاں کی بولی دوآبہ کی قدیم بولیوں سے متاثر رہی ہے۔ مسلمانوں کی فتح کے بعد دہلی ایک مرتبہ پھر سیاسی اور تمدّنی مرکز بن جاتا ہے۔ ایسی صورت میں پنجاب کا دہلی کے لسانی اثرات کو قبول کرنا بعید از قیاس نہیں۔

لسانی نقطۂ نظر سے گرو نانک کا کلام اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو نامدیو اور کبیر جیسے بھگتوں سے شروع ہوتا ہے یعنی ایک طرف فارسی عربی کے عام مروّجہ الفاظ کو جگہ دینا اور دوسری طرف ان لسانی اثرات کو بھی قبول کرنا جو دہلی کے سرچشمہ سے پھوٹ کر ہندستان میں چاروں طرف پھیل رہے تھے۔ گرو نانک کا بیشتر کلام ان کی مادری زبان یعنی پنجابی میں ہے۔ کچھ کلام شاعری کی روائتی اور معیاری زبان یعنی برج بھاشا میں لکھا گیا ہے کہیں کہیں زبان دہلوی کا اثر بھی نمایاں ہے۔ گرو گرنتھ آدمیں نانک کے نام سے تقریباً سب ہی گروؤں نے

لکھا ہے۔ لیکن "جپ جی" (گرنتھ کا پہلا حصہ) (مرتبہ ۱۶۰۴ء) نانک کا مستند کلام مانا جاتا ہے۔ چونکہ "گرو بانی" سکھوں کے لئے آوازِ الٰہی کا حکم رکھتی ہے۔ اس لئے مرتب کرتے وقت اس کی صحت کا بہت زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ دراصل اس وقت کبیر، نامدیو اور دوسرے بھگتوں کے کلام کی سب سے بڑی سند گرنتھ صاحب ہی سے ملتی ہے۔

گرو نانک کے کلام کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس میں پنجابی کے ساتھ ساتھ برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اسمار، افعال اور ضمائر بلا تکلف استعمال کئے گئے ہیں۔

(۱) پنجابی کے (دا۔ دی دے) کے ساتھ ساتھ ہر صفحہ پر (کا۔ کی۔ کے) ملتے ہیں۔ جو کھڑی بولی سے مخصوص ہیں۔ (دیکھئے صفحہ ۲۰ گرو گرنتھ آد۔ اردو ایڈیشن نول کشور پریس)۔

(۲) اسی طرح لک کے ساتھ ساتھ لاکھ (۳۹۲ گ۔گ۔آد) پچھے (صفحہ ۳) کے ساتھ پاچھے (صفحہ ۱۴۴) اُپر (صفحہ ۴) کے ساتھ اوپر (صفحہ ۳۹۰) کاچا (صفحہ ۲۹۷) بھا چار (صفحہ ۷)۔ پیار (صفحہ ۲۵ دکنی پرت)

(۳) [ڈ] کی آواز کے ساتھ ساتھ (ڑ) کی آواز بھی ملتی ہے۔ (دیکھئے صفحہ ۲۹)

(۴) افعال میں قدیم ہریانی اور دکنی کے وچارنا (صفحہ ۱۵) نکسنا (نکلنا صفحہ ۲۵) بوجھنا (صفحہ ۲۶) (بجھنا نہ تو دکنی میں ملتا ہے اور نہ گرنتھ صاحب میں) بھاونا۔ سماونا (صفحہ ۲۹) پتیانا (صفحہ ۳۰ یقین کرنا)۔

(۵) لفظ "والا" مابعد کا ارتقا ہے۔ قدیم دکنی، ہریانی اور پنجابی اور برج میں ہمیشہ "ہارا" آیا ہے۔ جیسے جانہارا، پانہارا، وغیرہ (دیکھئے گرو گرنتھ آد صفحہ ۳۴) اس لئے "ہارا" کو کسی خاص بولی سے مخصوص نہیں کیا جا سکتا۔

(۶) ضمائر بیشتر اُردو ہی کے استعمال کئے گئے ہیں، مثلاً ون (صفحہ ۲ یعنی اُن، آج تک دہلی اور میرٹھ کے اضلاع میں مستعمل ہے) تیرے (صفحہ ۱۰) میرے (صفحہ ۱۲) تیری (صفحہ ۱۳)، ہمری (صفحہ ۱۳) تمہارے (صفحہ ۱۴) ہمارا (صفحہ ۲۰)۔

عربی، فارسی الفاظ کی جتنی کثرت نانک کے یہاں ملتی ہے۔ اس عہد کے دوسرے صوفی شعرا کے یہاں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ گرو گرنتھ صاحب میں بعض اشعار اور دوہے تو فارسی تک کے شامل کر دیئے گئے ہیں۔ اس میں ریختہ کی شکل بھی نظر آتی ہے۔ لیکن "جب جی" کے علاوہ گرنتھ صاحب کے دوسرے حصے گرو نانک کی تصنیف نہیں کہے جا سکتے۔ کیونکہ بعد کے سکھ گروؤں نے بھی اس تخلص کے ساتھ دوہے لکھے ہیں۔ اس لئے ہم نے اپنے لسانی تجزیہ کو "جب جی" تک محدود رکھا ہے۔ لیکن گرو نانک کے کلام کا جو بھی مستند حصہ ہمیں گرنتھ صاحب میں ملتا ہے۔ وہ اسی لسانی ارتقا کا آئینہ دار ہے۔ جس کی شہادت مرہٹواڑی کے نام دیو اور پورب کے کبیر داس جی کے کلام سے ملتی ہے۔

گرو نانک کا مستند کلام

گرو پیر سادی بوجھے تو ہوئی نبیرا — گھر گھر نام نرنجنا سو ٹھاکر میرا
اندھے اکلی باہرے کیا تن سوں کہیے — بن گرو پنتھ نہ سوجھی کس ودہی نر بہیے
آوت کو جاتا کہیں، جاتے کو آیا — پر کی کو اپنی کہیں، اپنو نہیں بھایا
میٹھے کو کڑوا کہیں، کڑوے کو میٹھا — راتے کو نندا کر ہیں ایسا کل ماہی دیٹھا

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی کہ بابر کی فتح دہلی ۱۵۲۶ء سے قبل ہی دہلی میں ایک نئی زبان کا ہیولےٰ تیار ہو چکا تھا۔ خسروؒ کی پہیلیاں مستند نہ سہی لیکن صوفیائے کرام کے اقوال اور خاص طور سے نامدیو اور کبیرؔ کی زبان اس بات پر شاہد ہے

کہ شورسینی اپ بھرنش کا ورثہ اس وقت زبان دہلی کو مل رہا تھا جو کہ مسلمانوں کے ہاتھوں ایک نیا چولا بدل رہی تھی۔ دہلی کے دارالسلطنت بنتے ہی لاہوری زبان پر دہلی کے اطراف کی زبان غالب آجاتی ہے۔ تغلقوں کے عہد میں دہلی کے اندر ہریانہ کی آبادی کا جمگھٹ تھا۔ کھڑی بولی کے علاقے اور شہر دہلی کے درمیان جمنا حائل تھی جس کے اوپر سے آمد و رفت کے وسائل محدود تھے۔ اس لیے بازاری آبادی زیادہ تر ہریانوی آبادی پر مشتمل تھی۔ فارسی کے علاوہ عرصہ تک ادبیات میں راجستھانی اثرات غالب رہے۔ بابر کے داخلۂ دہلی تک اُن اثرات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے۔ بابر کا دربار لگا ہوا ہے۔ ایسے میں ابراہیم لودھی کا سر کاٹ کر سامنے لایا جاتا ہے۔ اس وقت کوئی ہندی شاعر کہہ اٹھتا ہے (جمعہ ۸ رجب ۹۳۲ھ / ۱۵۲۶ء) دوہرہ ؎

نوسے اوپر تھا بتیسا پانی پت میں بھارت دلیا
اٹھیں رجب سکر بارا بابر جیتیا براہیم ہارا[1]

اس دوہے کی زبان کا تجزیہ کیجیے تو اس کی قدامت پر صاد کرنا پڑتا ہے۔ ویسا اور 'اٹھیں' قدیم زبانِ دہلوی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ رجب کا رجّب۔ اپ بھرنشی صوتیات سے مطابقت رکھتا ہے۔ جیسے کہ پرتھوی راج راسو میں کمان کو کمّان۔ عربی کو عرّبی وغیرہ باندھا گیا ہے۔ البتہ ایک چیز دلچسپ ہے۔ ابراہیم کو براہیم صرف ایک فارسی وا[...]

---

[1] قلمی نسخہ تاریخ داؤدی کی اصل فارسی عبارت یہ ہے۔

"بعضے گویند کہ سلطان ابراہیم را در ویرانہ شناختہ، جمعے از نزدیکانش ہلاک شدہ یافتند۔ سرش بریدہ بہ بابر شاہ آوردند۔ شخصے در آں معرکہ حاضر بود ایں شعر بہ زبان ہند کہ تمام واقعہ آں جنگ بودہ، شعر نمودہ است"

باندھ سکتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف مسلمان ہوگا۔

بابر نے صاف صاف ہندوستان کی زبانوں سے لاعلمی کا اظہار کیا ہے۔ "نہ ہم یہاں کی بولی سمجھ سکتے ہیں اور نہ یہاں والے ہماری زبان جانتے ہیں۔ ہمارے آدمیوں کے لئے یہاں کی زبان نئی ہے اور وہ اس سے بھڑک رہے ہیں"[1] لیکن بابر کی یہ بھڑک بہت جلد ختم ہو گئی جس کا ثبوت اس کا یہ مشہور شعر ہے ؎

مجکا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی
فقرا حلیفہ بس بولغو سید و ریانی و روئی

(مجھے موتیوں کی کچھ ہوس نہیں، فقیروں کے لئے ایک ٹکڑا روٹی اور تھوڑا سا پانی بس ہے)

ہمایوں کے دربار میں کچھ فارسی کے شاعر ایسے بھی تھے جو ہندی زبان میں شعر کہتے تھے۔ اُن میں شیخ گدائی دہلوی مشہور ہیں لیکن ان کی کوئی چیز اب تک نہیں مل سکی ہے البتہ ہمایونی عہد کے مشہور شاعر ہندی چھیم کے کلام کے بعض نمونے مل جاتے ہیں[2] جس پر اپ بھرنش کا گہرا اثر نظر آتا ہے۔ مثلاً ایک "چھپے" کے قافیے یہ ہیں۔ پلیٹھو۔ بیٹھو۔ گھیٹو۔ جیٹھو وغیرہ۔

اکبر کے عہد میں بعض وجوہ کی بنا پر 'زبانِ دہلوی' کو صدمہ پہونچتا ہے۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ اکبر نے آگرہ اپنا صدر مقام بنا کر برج بھاشا اور راجھستانی بولیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا۔ دوسرے یہ کہ اُسی زمانے میں کرشن بھکتی کے بڑے مبلغ ولبھ آچاریہ نے گوکل (متھرا) کو اپنی تحریک کا بڑا مرکز بنایا۔ اس طرح مذہب اور سیاست

---

[1] بحوالہ "مغل اور اُردو" نصیر حسین خیال صفحہ ۳
[2] شیو سنگھ سروج صفحہ ۱۰۲، مرتبہ شیو سنگھ سینگر: نول کشور پریس لکھنؤ ۱۹۲۶ء

کا سہارا لے کر آگرہ اور متھرا کے نواح کی بولی چمک اٹھی۔ چنانچہ سولہویں صدی سے لیکر اٹھارہویں صدی عیسوی تک برج بھاشا واحد ادبی زبان کی حیثیت سے شمالی ہند میں رائج رہتی ہے۔ جائسی کی پدماوت اور تلسی داس کی رامائن کو چھوڑکر اس عہد کا جو بھی قابلِ قدر اور گراں مایہ ادب ہے سب برج بھاشا میں ہے۔ غرضکہ اس طرح دہلی کے بازاروں کی نئی خام زبان ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے۔ اس کا ثبوت گوسوامی گوکل ناتھ وغیرہ کی برج بھاشا کے نثری نمونوں سے ملتا ہے جس میں جابجا ہندوستانی (زبانِ دہلوی) کا پٹ بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً آئی۔ کریں۔ سنی۔ گئے۔ رہے گی۔ تماسا (تماشا) جتنے ہووے۔ نہیں[۱] وغیرہ۔

اِن الفاظ میں پُرانے پن کی وہ جھلک نہیں ملتی، جو قدم قدم پر دکنی زبان میں پائی جاتی ہے۔ دراصل اُردو زبان کے ارتقا کے سلسلے میں دارالسلطنت آگرہ اور برج بھاشا نے جو حصہ لیا ہے اس پر بہت ہی کم زور دیا گیا ہے۔ اُردو زبان اور اس کے محاورے اور تلفظ کی وہ نئی شکل جس کی تکمیل بعد کو لکھنؤ جاکر ہوتی ہے۔ اُس کا بیج آگرہ ہی میں اکبر کے عہد میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس زمانہ میں شہر آگرہ بدیسی مسلمانوں سے زیادہ راجپوتوں کے زیرِ اثر تھا۔ محلاتِ شاہی میں راجپوت رانیاں تھیں، دربار میں ہندی سنگیت کا چرچا تھا، اُسی فضا میں ادبی حیثیت سے برج بھاشا کا پروان چڑھنا کوئی تعجب کی بات نہیں، چونکہ گوالیر کا سنگیت[۲] مشہور تھا۔ اس لئے گوالیری برج مستند سمجھی جانے لگی۔ خان[۳] آرزو نے اپنی تصحیح غرائب اللغات

---

[۱] ہندی بھاشا اور ساہتیہ کا وکاس: ہری اودھ (صفحہ ۶۲۲)

[۲] گوالیری سنگیت کا سہارا لے کر کس طرح مغل دربار پر چھائی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں جن ۳۲ خداوندانِ موسیقی کے نام دیئے ہیں اُن میں سے سولہ گوالیری تھے جن میں تان سین اور میاں لال کلاونت مشہور تھے۔

[۳] تزکِ جہانگیری میں راجپوت کی مؤنث راجپوتانی بار بار آیا ہے۔ جو خالص بندیلی اور گوالیری برج کی ترکیب ہے۔ اُردو اور پنجابی میں 'راجپوتنی' کہتے ہیں۔

ہندی میں اُسی سے سندلی ہے۔ خود اکبر کے متعلق مشہور ہے کہ وہ برج میں شعر کہا کرتا تھا۔ صاحب شیو سنگھ سروج (صفحہ ۲۰۵) نے ایسے بہت سے دوہے اور کبت نقل کئے ہیں جو اکبر سے منسوب کئے جاتے ہیں۔

جا کو جس ہے جگت میں، جگت سراہے جاہی
تا کو جیون سپھل، کہت اکبر ساہی

(دنیا میں جس کو شہرت حاصل ہے اور دنیا جسے سراہتی ہے۔ اکبر شاہ کے بقول اسی کا جیون کامیاب ہے)۔

(کویتا کومدی حصہ اوّل۔ رام نریش تری پاٹھی صفحہ ۴۸)۔

اکبر سے منسوب ایک اور دوہا ہے جو اُس نے آخری عمر میں تصنیف کیا تھا۔

پیتھالا سوں مجلس گئی، تان سین سوں راگ
ہانسی بو، رمی بو، بولی بو، گئیو بیربل ساتھ

آخری عمر میں اپنے ساتھیوں کو یاد کر کے اکبر کہتا ہے کہ "پیتھالا (بیکانیر کا پرتھوی راج) کے ساتھ مجلس گئی اور تان سین کے ساتھ راگ۔ ہنسی، دلچسپی، اور کلام کا لطف بیربل کے ساتھ فنا ہو گیا۔"

(بحوالہ انڈو ایرین اور ہندی صفحہ ۱۵۱ ڈاکٹر چٹرجی)۔

اکبر کے درباری میں برج بھاشا کے مشہور شاعر رحیم خانِ خاناں تھے جن کے متعلق جہانگیر نے اپنی توزک میں یہ الفاظ لکھے ہیں۔

"زبان عربی و ترکی و فارسی می دانست و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتیٰ علوم ہندی بہرۂ وافی داشت...... و بزبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتے"[1]

---

[1] بحوالہ اورنٹیل کالج میگزین ص ۱۲

لفظ ہندی سے مراد یہاں یا تو برج بھاشا ہے یا سنسکرت۔ رحیم برج کے مانے ہوئے شاعر ہیں۔ اُن کی زبان مستند سمجھی جاتی ہے۔ اُن کے سنسکرت کلام کا مجموعہ بھی "رحیم ولاس" کے نام سے برج رتن داس نے حال میں مرتب کیا ہے۔

ہندوستانی (کھڑی بولی) کے ارتقا کی داستان کو مکمل کرنے کے لئے ہندی کی ان نثری تصانیف کا حوالہ بھی ضروری ہے جن میں یہ سنسکرت کا سہارا لے کر ادبی زبان کی شکل اختیار کرتی ہے۔ اس سلسلے میں برج بھاشا کی نثر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح گوسوامی بھٹل ناتھ کی "رادھا کرشن وہار" اور اُن کے بیٹے گوسوامی گوکل ناتھ کی "چوراسی ویشنوؤں کی وارتا" تک میں برج بھاشا کے اندر ہی مروجہ ہندوستانی عنصر مل جاتا ہے اکبر ہی کے عہد میں گنگ کوی نے ۱۵۷۰ء میں "چند چھند برنن کی مہیما" کھڑی بولی ہندی میں لکھی۔ اس کے چند اقتباسات ذیل میں دیئے جاتے ہیں۔

(۱) "اکبر ساہ جی عام کھاس (خاص) بیں تکھت (تخت)، اوپر در اجمان ہو رہے ہے اور عام کھاس بھرنے لگا ہے۔ جس میں تمام امراد آئے آئے کورنش بجائے جہار کرکے اپنی اپنی بیٹھک پر بیٹھ جایا کریں اپنی اپنی مسل سے جن کی بیٹھک نہیں سو ریشم کے رسّے میں ریشم کی لوٗ میں پکڑ پکڑ کے کھڑے تاجیم (تعظیم) میں رہے۔"

(۲) "اتنا سُن کے پات ساہی جی شری اکبر صاحب جی آدھ سیر سونا نرہر داس چارن کو دیا۔ ان کے ڈیڑھ سیر سونا ہو گیا۔ راس بنچنا پورن بھیا عام کھاس برکھاس (برخاست) ہوا۔"[1]

مذکورہ بالا اقتباسات سے صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ آگرے پہونچ کر زبان دہلوی کا کیا ڈول ہو گیا تھا۔ قطع نظر سنسکرت کے الفاظ کے اُن میں "کروگے"، "کہیں گے"، "اوپر"

---

[1] ہندی ساہتیہ کا اتہاس صفحہ ۳۳۶ تا ۳۳۷: رام چندر شکلؔ

"ہو رہے" "جس میں" "کر کے" "اپنی" کے نئے پن پر نظر رکھیے۔ ساتھ ساتھ عام خاص۔ تمام امرا و۔ کورنش۔ مثل وغیرہ فارسی الفاظ کا میل بھی قابلِ غور ہے۔ مذکورہ بالا اقتباسات میں کہیں بھی تو پنجابی یا ہریانی پن نہیں پایا جاتا۔

مذکورہ بالا تفصیلات سے حسبِ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

(۱) کھڑی بولی، برج بھاشا کے ساتھ ساتھ شورسینی اپ بھرنش سے پیدا ہوئی بلکہ برج بھاشا سے کچھ قبل ہی وہ سلاطین دہلی کے ابتدائی عہد میں ایک خاص شکل اختیار کر لیتی ہے جس کی معیاری شکل کے متعلق نمونوں کے فقدان کی وجہ سے ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) یہ امر بھی مسلم ہے کہ اکبر کے عہد سے مغلوں کے حرم سرا کی زبان قدیم ہندوستانی تھی۔ جس میں حسبِ موقع راجستھانی، پنجابی یا برج بھاشا کا پٹ بھی آ جاتا تھا یہی زبان امرا اور روساء کے گھرانوں میں بولی جاتی تھی۔ لیکن دربار اور راج پاٹ کے کاموں کے لئے فارسی کا استعمال ہوتا تھا۔ جو مسلمان اُمراء ہندی شاعری اور سنگیت کے رسیا تھے وہ برج بھاشا بھی سیکھتے تھے۔

(۳) دہلی سے آگرہ کو دارالسلطنت کا منتقل ہونا لسانی اعتبار سے اُسی قدر اہمیت رکھتا ہے جتنا کہ سیاسی اعتبار سے۔ برج بھاشا کے بھاگ پھرتے ہیں۔ زبانِ دہلوی پر کچھ عرصہ کے لئے سایہ آجاتا ہے۔ چنانچہ عہدِ اکبری اور جہانگیری کی تصانیف اور تذکروں میں (جیسا کہ بالتفصیل آگے بتایا جائے گا) جہاں کہیں لفظ "ہندی" آیا ہے اس سے مراد یہی برج بھاشا ہے نہ کہ کھڑی بولی۔ دہلی تک میں برج بھاشا کا چرچا تھا۔ برج بھاشا کے مشہور شاعر رس کھان (خان) دہلی کے ایک پٹھان سردار تھے جنہوں نے ۱۶۱۴ء سے کرشن بھگتی کی شاعری شروع کی۔

(۴) برج بھاشا ادبی لباس میں سب سے پہلے سولھویں صدی عیسوی میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اِسے کھڑی بولی کے مقابلہ میں سبقت حاصل ہو گئی جس طرح یہ بھی تاریخی اتفاق تھا کہ علاء الدین اور محمد تغلق کے لشکروں کے ساتھ جو زبان دکن میں پہونچی ہے وہ کھڑی بولی اور ہریانی کی قدیم شکل ہے نہ کہ برج بھاشا کی۔ اگر دکن کی فتوحات عہدِ اکبری تک ملتوی ہو جاتیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہاں دکنی کی بجائے برج بھاشا کی وہ شکل نظر آتی جو سورداس اور رحیم خانخاناں کے دوہوں میں ملتی ہے۔ زبانِ شعر کی حیثیت سے برج بھاشا دکن میں بعد کو پہونچتی ہے۔ جس کا وافر ثبوت ہمیں ملا وجہی کی "سب رس" میں مل جاتا ہے۔

مغلوں کے آگرہ کے دورانِ قیام میں ہندوستانی زبان میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوتا ہے۔ جسے ہم "سنکرتیت" کا نام دے سکتے ہیں۔ پراکرت اور اپ بھرنش کی سب سے بڑی پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اُس میں اِس "سنکرتیت" سے عام انحراف ملتا ہے۔ اس کے برخلاف جدید آریائی زبانیں جب ادبی شکل اختیار کرتی ہیں تو اُنہیں خواہ مخواہ سنسکرت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ مسلمانوں کی آمد سے "سنسکرتیت" کے اس رجحان کو زبردست صدمہ پہونچا۔ اُنھوں نے اپنا خزانۂ الفاظ بیشتر فارسی اور عربی سے لیا۔ اور ہندوستانی الفاظ کی صحت کی مطلق پرواہ نہ کی۔ چنانچہ دکنی ادبیات میں سنسکرت کے اکثر الفاظ توڑ مروڑ کر ذیل کی شکل میں ملتے ہیں۔[1]

پرم، پیم (پریم)، پرت (پریت)، دشٹ دس: درشٹی = نظر)، چمن (چمبن = چومنا)، سہس (سہسر = ہزار)، سرپ (سرپ = سانپ)۔ انجھو (اشرو = آنسو)۔

---

[1] یہ تمام الفاظ "شہ پارے" اور "سب رس" سے لئے گئے ہیں۔

سیتل (شیتل = ٹھنڈا)، بچن (وچن = قول، بول)۔ بست (وستو = چیز) برن (ورن، رنگ) کیس (کیش = بال) وغیرہ۔

لیکن لسانیاتی تبدیلیاں چونکہ نہایت چپکے اور چھُپ کے رونما ہوتی ہیں اس لئے "سنسکرتیت" کے بڑھتے ہوئے عام رجحان سے مسلمانوں کو بھی مفر نہ تھا۔ اس کی شہادت ہمیں قدیم دکنی ادب سے ملتی ہے۔ جہاں خالص سنسکرت کے بے شمار الفاظ بلا تکلف نظم و نثر میں استعمال کئے گئے ہیں۔

میگھ (بادل)۔ دوت (پیامبر)۔ نین۔ داس۔ ترلوک (تینوں عالم)، چتر (ہوشیار) جیو (جی)۔ چرن (قدم) چنتا (فکر)۔ دنکر (دن کرنیوالا۔ سورج) درپن (آئینہ) درشن۔ دیہہ (جسم)۔ سور (سورج)۔ روی (سورج)۔ رکت (خون)۔ شبد (لفظ) سنگرام (لڑائی)۔ سیس (سر) ہردے (دل)۔ اَدھک (زیادہ)۔ بہو (بہت) وانر (بندر)۔ الک (زلف)۔ پرگٹ (ظاہر) وینا (بین)۔ رتن۔ چندر۔ انتر (راز) استری۔ بھان (سورج)۔ پُستک (کتاب)۔ وغیرہ[1]

جیسا کہ تزک جہانگیری اور دیگر تواریخ کے ہندوستانی الفاظ سے ظاہر ہے۔ سنسکرتیت کے رجحان کو آگرہ اور گوکل (متھرا) کی فضا میں تقویت حاصل ہو جاتی ہے۔ توزک میں ذیل کے الفاظ ملتے ہیں:

جگت جوت۔ برکھ (درخت)۔ تھل کنول۔ سرب باسی (تارک ہمہ چیز)، اکبر جام کو "سرب گاتی" کہتا ہے۔ (گات۔ خالص سنسکرت بمعنی جسم)، برقع کو 'چتر گیت'، جوتے کو 'چرن دھرن'، موبافہ کو "کیس گہن"۔

---

[1] یہ تمام الفاظ "شہ پارے" اور "سب رس" سے لئے گئے ہیں۔

اسی رجحان کا اظہار محلات شاہی اور ہاتھیوں کے ناموں سے ہوتا ہے۔

قدیم اُردو کا ہتھی (ہاتھی)، آگرہ جا کر سنسکرت کا "گج" ہو جاتا ہے مثلاً شاہی ہاتھیوں کے نام رتن گج، فتح گج۔

محل کی بجائے شاہی محلات کے لئے "بھون" استعمال ہوتا ہے جیسے مچھی بھون۔

اس عہد کی تصانیف میں ریختہ کا لفظ بھی دو جگہ ملتا ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں (۱۵۵۶ء تا ۱۶۲۶ء) برج بھاشا کے ساتھ ساتھ ریختہ میں بھی شاعری کرتے تھے۔ ایک جگہ اُنہوں نے لکھا ہے۔

جُھک جُھک متوالا گاڈ تار ریختہ تھا

لیکن یہاں ریختہ اسی مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے جس میں خسروؒ نے کیا ہے۔ یعنی موسیقی کی ایک اصطلاح کے طور پر۔ البتہ توزک میں ریختہ زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ لیکن توزک میں جہاں جہاں بھی لفظِ "ہندی" زبان کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اس سے مراد برج بھاشا ہی ہے نہ کہ اُردو جیسا کہ پروفیسر شیرانی کا خیال[1] ہے۔ ورنہ ابوالفضل آئینِ اکبری میں "زبان دہلوی" کو ایک علیحدہ زبان کی حیثیت نہ دیتا۔

شاہ جہاں کے عہد تک برج بھاشا منجھ کر شمالی ہند کے بڑے حصے کی واحد ادبی زبان بن جاتی ہے۔ پنجاب سے لے کر بنارس تک (غازی پور کے عثمان برج کے مشہور شاعر ہیں جو جہانگیر کے عہد میں ہوئے تھے) اسی کا دور دورہ تھا۔ کھڑی بولی

---

[1] اورینٹل کالج میگزین۔ اگست ۱۹۳۱ء صہ ۱۶

کے علاقہ میں تو یہ عام طور سے ادبی زبان کی حیثیت سے رائج تھی۔ شاہ جہاں نے اسی برجی ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ اس کی ماں راجپوتنی تھی۔ وہ شاہی زبان ترکی سے بے بہرہ تھا۔ جہانگیر کو اس کا بڑا افسوس رہا۔ جب اس نے آگرہ چھوڑ کر نئی دہلی بسائی (۱۶۴۷ء) تو "زبانِ دہلوی" کا ستارہ پھر چمک اٹھا۔ چنانچہ اردو کو ہمارے تذکرہ نویس عہدِ شاہجہانی ہی سے منسوب کرتے آئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ "زبانِ دہلوی" کو حیاتِ نو شاہجہاں ہی کے ہاتھوں ملی۔ اگر آگرہ آخر وقت تک مغلوں کا دار السلطنت رہتا تو یہ بتانا دشوار ہے کہ کھڑی بولی اور برج بھاشا کی نبرد آزمائی کا نتیجہ کیا نکلتا۔

۱۶۴۷ء میں دہلی پہونچ کر شاہجہاں اور اس کے دربار کو یک لخت احساس ہوتا ہے کہ ان کا سابقہ ایک نئی بولی سے پڑا ہے لیکن دربار کے ساتھ ساتھ برج بھاشا بھی دہلی جاتی ہے۔ جہاں اس کے اثرات بہت آہستہ آہستہ زائل ہوتے ہیں۔ دہلی کے ادبی حلقوں میں برج بھاشا کی عام مقبولیت کی شہادت ہمیں مرزا خاں کی "تحفۃ الہند"[1] سے ملتی ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۶۷۶ء ہے۔

> "و زبانِ اہلِ برج افصح زبانہا است۔ اینچہ میان دو آب گنگا و جمنا کہ دو آبہ مشہور اند واقع شدہ است مثل دارو غیرہ بہ فصاحت منسوب است وچند وارنام موضع است و بر زبانِ اہلِ نظم و صاحب طبع بیشتر مستعمل و جاری است۔ بنا بر آں بہ قواعدِ کلیہ آں پرداختہ آمد" (صفحہ ۵۴ تا ۵۵)

---

[1] ۱۶۷۶ء میں شاید عالمگیر کے ایما سے مرزا خاں نے برج بھاشا کی یہ قواعد اعظم شاہ کے لئے لکھی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہزادوں کو فارسی ترکی کے علاوہ ایک ہندی زبان کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہ برج بھاشا کی سب سے قدیم قواعد ہے۔ جسے پروفیسر ضیاء الدین نے مرتب کر کے شانتی نکیتن بنگال سے شائع کیا ہے۔

مرزا خان کے اقتباس سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں برج بھاشا شعر و ادب کی زبان تھی جس کے محاورے اور کہاوتیں آج بھی اُردو کا جزو بنے ہوئے ہیں۔

برج بھاشا کی ہمہ گیریت کا اندازہ مرزا خاں کے اِس اقتباس سے بھی ہو سکتا ہے۔

"واں (برج بھاشا) زبان عالمی است کہ مادر دیم۔ واطلاق آں، سوائے سنسکرت و پراکرت، عموماً شامل جمیع زبانہاست، وخصوصاً زبان اصل برج بود۔ وبرج نام سرزمین است در ہند اصل آں متھرا بود۔"

برج بھاشا کے اس عروج کے ساتھ ساتھ ہندوستانی (کھڑی بولی) بھی کچھ اُردو اور کچھ ہندی ادبیات میں نکھر رہی تھی۔ اس عہد کے ہندی کے نثر نگاروں مثلاً گنگ بھٹ، دولت رام نابھا داس، بنارسی داس، اور جٹمل کی زبان کا لسانی تجزیہ کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستانی سے قدیم پنجابی کے اثرات زائل ہو چکے تھے۔ ان کے یہاں زبان کی بعض حسب ذیل شکلیں ملتی ہیں۔

(۱) بنارسی داس اور جٹ مل (سترھویں صدی)

ہوا ہے۔ سن کر۔ لے کر۔ ہوئی۔ جاکے۔ ہووے۔ کرتا ہے۔ بنائی۔ رہنے والا۔ ہوتا ہے۔ دیکھتا نہیں۔ (ہندی بھاشا اور ساہتیہ وکاس: ہری اودھ صفحہ ۳۲۵)۔

مذکورہ بالا اقتباسات سے ہندوستانی کا وہ روپ جو اُردو کے ادبیات کے نمونوں کے فقدان کی وجہ سے اب تک اوجھل تھا۔ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ روپ نئی ہندوستانی کا ہے۔ وہ ہندوستانی جو قدیم اپ بھرنش لسانی روایات کو توڑ چکی ہے

جس پر سے پنجابی اور ہریانی کا وقتی اثر بھی زائل ہو چکا ہے جس کی تربیت برج بھاشا کے ہاتھوں ہو چکی ہے اور جو لسانی ارتقا کے مدارج میں قدیم دکنی سے بہت آگے ہے۔

(۲) نرنجنی : (اٹھارہویں صدی عیسوی)

کو ۔ ہے ۔ جس سے ۔ سب ہیں ۔ اور ۔ جس میں ۔ ہوتے ہیں ۔ کے ۔ ہے ۔ جیتے ہیں ۔ ایک ۔ پیدا ہوا ۔ وہ ۔ اس کے ۔ دُور کرنے ۔ کرکے ۔ بیٹھے ۔ کی ۔ کہ ۔ آپ ۔ جانن بارے ۔ مجھ ۔ میرے ۔ کرو ۔ دونوں ۔ سمجھائے کے کہو ۔ نہیں ۔ ہونا ۔ نہ ۔ سے ۔ ہوتی ۔ (نمونہ ہندی ساہتیہ کا اتہاس ۔ صفحہ ۲۲۷ : رام چندر شکل)۔

(۴) دولت رام (آغاز اُنیسویں صدی)

کے ۔ مانا ۔ دیش ۔ سندر ۔ ہے ۔ جہاں ۔ بسے ہیں ۔ سدا ۔ اور ۔ ڈھیر ۔ ہو رہے ہیں ۔

شاہجہاں کے عہد کی فارسی تصنیفات میں ہندی کے ساتھ ساتھ ہندوستانی کا لفظ بھی زبان کے لئے عام طور پہ ملتا ہے۔ عبد الحمید لاہوری نے اس لفظ کو بارہا استعمال کیا ہے (دیکھئے بادشاہ نامہ جلد اول کا صفحہ ۲۹۲ و ۳۲۶ و ۳۱۹ و ۱۳۲)۔ ڈاکٹر سید سلیمان ندوی اور پروفیسر شیرانی دونوں کا خیال ہے کہ لفظ "ہندوستانی" اُردو زبان کے سلسلے میں اس عہد سے قدیم ہے۔ دونوں نے مورخ فرشتہ کی حسب ذیل عبارت نقل کی ہے جو اُس نے ابراہیم عادل شاہ (۹۸۶ھ تا ۱۰۳۷ھ) کی فارسی دانی کے سلسلے میں لکھی ہے :-

"بہ نوعے فارسی راخوب می گفت کہ باہندوستانی متکلم نہ می شد"

دکن کا مشہور مصنّف ملا وجہی اپنی تصنیف ۔ سب رس (۱۶۳۵ء) میں لکھتا ہے۔

"آغاز داستان زبان ہندوستان ...."

لیکن یہاں اس بات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ شمالی ہند اور دکن کے تذکرہ نویسوں نے لفظ "ہندوستانی" سے مختلف زبانیں مُراد لی ہیں جہاں تک اندازہ ہوتا ہے عہد شاہجہانی کے مورخ 'ہندوستانی' سے عموماً برج بھاشا مُراد لیتے ہیں۔ فرشتہ کی ہندوستانی اور وجہی کی 'زبان ہندوستان' سے مراد یقیناً قدیم اُردو (خسرو اور ابوالفضل کی زبان دہلوی) ہے۔ وجہی نے برج بھاشا کو "گوالیر کے چاتراں" کی زبان کے نام سے بھی یاد کیا ہے۔ عبدالحمید لاہوری نے اسی کو (جلد دوم صفحہ ۱۰۵) "زبانِ ہنود" لکھا ہے۔

شاہجہاں ہی کے زمانے میں نئی دہلی میں وہاں کی پرانی زبان نئے سرے سے زندہ ہوتی ہے۔ جو عہدِ عالم گیری میں برج بھاشا کے قدم ادبی حلقوں سے اکھاڑ دیتی ہے۔ بعض محققوں[۱] کے مطابق اُردو کی اوّلین غزل جو اس وقت دستیاب ہے۔ شاہ جہاں ہی کے عہد میں پنڈت چندر بھان برہمن (۱۵۷۴ء تا ۱۶۶۲ء) نے لکھی تھی۔

خدا جانے یہ کس شہر اندر ہمن کو لاکے ڈالا ہے
نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے
پیا کے ناؤں کی سمرن کیا چاہوں کروں کیسے
نہ تسبیح ہے نہ سمرن ہے نہ کنٹھی ہے نہ مالا ہے
پیا کے ناؤں عاشق قتل با عجب دیکھے ہوں
نہ برچھی ہے نہ کرچھی ہے نہ خنجر ہے نہ بھالا ہے

---

[۱] کیفیہ: صفحہ ۲۵ (پنڈت دتاتریہ کیفی)۔ (پنڈت جی نے یہ حوالہ نہیں دیا کہ غزل مذکورہ کہاں سے دستیاب ہوئی)۔

خوباں کی باغ میں رونق ہووے تو کس طرح یاراں
نہ دونا ہے نہ مردا ہے نہ سوکن ہے نہ لالہ ہے
برہمن واسطے اشنان کے پھرتا ہے بگیا میں
نہ گنگا ہے نہ جمنا ہے نہ ندی ہے نہ نالا ہے

غزل مذکورہ زبانِ دہلوی کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقش کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ اس عہد میں جتنے بھی نصاب تیار کئے گئے ہیں ان میں سند اسی بولی سے لی گئی ہے جو دہلی کے آس پاس جمنا کے مغربی کنارے کے اضلاع میں بولی جاتی تھی۔ اُردو کی پہلی لُغت جس کے مصنف میر عبدالواسع ہانسوی تھے جس کی تصحیح بعد کو خان آرزو نے کی اسی علاقے کی بولی پر مبنی تھی۔ اس میں عام طور سے (ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح دی گئی ہے۔ مثلاً
بڈھنا۔ چڈھنا۔ ایڈی یا پھر افعال واو زائدہ کے ساتھ۔ آوڈنا۔ گاوڈنا۔ پاوڈنا وغیرہ۔

جیسا کہ خان آرزو کی تصحیح غرائب اللغات سے معلوم ہوتا ہے۔ "زبان اُردوئے شاہی"[1] کو عالمگیر کے عہد میں ایک خاص اہمیّت حاصل ہوگئی تھی۔ اورنگ زیب کی سنگیت دشمنی نے برج بھاشا کے وقار کو زبردست صدمہ پہونچایا۔ اور اس کی فتح دکن نے بلاواسطہ "زبان دہلوی" کے ارتقا کو تیز تر کردیا۔ دہلی والوں کا دکن سے یہ نیا ربط ضبط لسانی اعتبار سے بہت ہی بار آور رہا۔ اورنگ آبادی دکنی اور دہلی کی زبان میں جو حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ اورنگ زیب کی فتح دکن ہی کا نتیجہ ہے۔ یہی زمانہ ہے۔ جبکہ دہلی کی عوامی زبان کا نام "زبان اُردو" یا "زبان اُردوئے شاہی" یا "زبان

---

[1] تصحیح غرائب اللغات ہندی قلمی نسخہ ٹن لائبریری۔

اُردوئے معلیٰ" پڑتا ہے۔ اور زبان دہلوی بزمِ ادب میں بار پاتی ہے۔ ولی کے پہونچنے سے قبل ہی دہلی میں ادبی تخلیق کے لئے زمین ہموار ہو چکی تھی۔ فارسی دانوں کو یہ احساس ہو چلا تھا کہ حسبِ خواہ داد نہیں ملتی ہے۔ برج بھاشا میں شاعری کرنا۔ رحیم اور عثمان کی طرح ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ برج بھاشا کے ہندو شاعر تتر بتّر ہو کر چھوٹی چھوٹی ہندو ریاستوں میں پناہ لے رہے تھے۔ چنانچہ اس عہد کے ہندی ادبیات کے جتنے بھی شاعر ہیں اُن کا تعلق راجپوتانہ یا وسطی ہندوستان کی کسی نہ کسی ہندو ریاست سے تھا مسلمان شعراء نے "زبان اُردوئے شاہی" کو پہلے تو ہندی پنگل (ہندوستانی عروض) پر آزمایا۔ جیسا کہ ہریانوی مصنفین (محبوب عالم وغیرہ) کے کلام سے ظاہر ہے۔ لیکن اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی۔ کیونکہ اس عروض پر ڈھل کر زبان خود بخود شعروادب کی زبان برج بھاشا کا سانچہ قبول کر لیتی تھی۔ چنانچہ اس عہد کی ادبیات میں ہمیں ایک بھی مثال ایسی نہیں ملتی کہ شاعر نے کوئی دوہا، گیت یا چھپئے یا چوپائی صاف کھڑی بولی میں لکھی ہو۔ رفتہ رفتہ ریختہ کی شکل میں نئی زبان، نئے عروض پر ڈھلنے لگی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا نام مولانا محمد افضل (وفات ۱۶۲۵ء) ساکن جھنجھانہ (ضلع میرٹھ) کا ہے جس کا حوالہ میر حسن نے اپنے تذکرہ میں ذیل کے الفاظ میں کیا ہے۔

محمد افضل، افضل تخلص، از قدیم است کدام ہندو بچہ گوپال نام بود کہ بر و عاشق شدہ حسبِ حال خود بارہ ماسہ عرف بکٹ کہانی گفتہ کہ اکثر کھتریان وگانیان مشتاق آدمی باشند نصفے فارسی و نصفے ہندی دارد۔ لیکن قبولیت دادالٰہی است بردلہا اثری کند۔
(بحوالہ پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۷۹)

اس کے بعد افضل کے یہ دو شعر نقل کئے ہیں۔

پڑی ہے گل میں میرے ہیم پھانسی   مرن اپنا ہے اور لوگوں کی ہانسی

مسافر رے جنہوں نے دل لگایا — اُنہوں نے سب جنم روتے گنوایا

(تذکرہ میرحسن)

اس پر شیرانی نے لکھا ہے "ہمارے مورخین کا یہ عقیدہ ہے کہ شمالی ہند میں اُردو شاعری ولی کی آمد اور محمد شاہی دور تک وجود میں نہیں آئی تھی لیکن محمد افضل کے 'دوازدہ ماہہ' کی موجودگی میں ہمیں اس عقیدہ میں ترمیم کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔" اہلِ دہلی کو دکنی پر اپنی زبان کے تفوق کا جو احساس تھا اس کا اظہار شاہ گلشن کے ان الفاظ سے ہوتا جو انہوں نے ولی سے کہے تھے۔ "وشما زبان دکنی را گذاشتہ ریختہ را موافق اُردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد موزوں بکنید۔"

افضل کی زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے تو قدیم دکنی کی ابتدا پر بھی روشنی پڑتی ہے اور یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ دکنی زبان کا جواز ہریانی اور ہندوستانی (کھڑی یا زبان دہلوی) سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ گو کئی لحاظ سے افضل کی اُردو، دکنی کے مقابلہ میں ارتقا یافتہ ہے۔

اسماء ضمائر:-

مجھ۔ جنوں (سب رس میں بھی ملتا ہے)۔ مجھ (مفعولی، دکنی کے مطابق)، ہم کوں آپس کوں (دکنی میں بھی ملتا ہے)، ہمن سے (ہم سے، دکنی میں ملتا ہے)۔

حروف: کن (کنے)۔ کوں (دکنی کے مطابق)۔ باجھ (بغیر: قلی قطب۔ ع پیا باج پیالہ پیا جائے نا)، سوں، سیں (دکنی کے مطابق)، اجھوں (ابھی دیکھئے ق۔م دکنی)۔ لگ (دیکھئے ف۔ق۔م۔دکنی)۔

افعال: لاہی (لگائی دیکھئے ف۔س۔ر)۔ لاگی (دیکھئے ف۔ق۔م)۔

(افضل کی زبان کا یہ نمونہ "پنجاب میں اُردو" میں شامل ہے)۔

اس سلسلے میں عہدِ عالم گیری کے ایک دوسرے مشہور مصنّف شاہ سید برکت اللہ پیمی مارہروی کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے۔ شاہ برکت اللہ کا ہندی کلام "پیم پرکاش" (سنہ تصنیف ۱۶۹۸ء) حال ہی پنڈت لچھمی دھر نے دہلی سے شائع کیا ہے[1]۔ شاہ موصوف کا شمار اُنہیں شہراروں میں ہوگا جو دو بڑے تمدنوں سے ٹکرانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ شاہ برکت اللہ کو ہندی، فارسی اور عربی پر کامل عبور تھا۔ تصوف سے لبریز انسانیت کے پیغام کو اُنھوں نے دوہوں اور کبتوں کے ذریعے پہونچانا چاہا ہے۔ لیکن مارہرے میں بیٹھ کر وہ بھی ان اُٹھتی ہوئی لسانی لہروں کے اثرات سے نہ بچ سکے جو عہدِ عالمگیری میں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچ رہی تھیں۔ اُنہوں نے چند ریختے بھی لکھے ہیں۔ جن کی زبان اس عہد کے لسانی حالات کی غمازی کرتی ہے۔

گھر تج کے جا جنگل میں پری تب سجھ پری
تن من میں پیم کی آگ بری تب سجھ پری

موجوں کے پھیر کوں جو دلِ غیر بوجھتا
جب سندھ کے بھنور میں پری تب سجھ پری

تکیہ جو مخملی و دگر سیج چھوڑ کے
جب اینٹ زیرِ سیس[2] دھری تب سجھ پری

جت تت پھرے سے من کو تسلّی نہ کچھ بھئی
جب دل کی کیل مانجھ اری تب سجھ پری

---

[1] شاہ برکت اللہ کا ہندی ادب میں اضافہ (انگریزی) ۱۹۴۹ء [2] سر

کنج خفی میں وصل ہوئی فکر و غم نہ تھا
جب ہیہے[1] میں لگائی چھری تب سمجھ پری

بو جھا نہ عشقبازِ خرد۔ راہ پیم کا
جب عشق سدھ بدھ ہری تب سمجھ پری

شاہ ہمی مذکورہ بالا ریختہ برج بھاشا کے پٹ کے باوجود کھڑی بولی میں ہے۔ لیکن شاید اس زمانے میں ریختہ کھڑی بولی اور فارسی ہی کی آمیزش سے نہیں بنتا تھا۔ بلکہ اس کی ترکیب (جیسا کہ بعد کو میر تقی میر نے اپنے نکاتِ سخن میں بتایا ہے) کئی طرح سے کی جاتی تھی۔ مثلاً شاہ ہمی کے یہاں حسب ذیل انداز میں ملتی ہے۔

(۱) کھڑی بولی + عربی فارسی الفاظ

(۲) برج بھاشا + فارسی کے مصرع

(۳) کھڑی بولی + فارسی (نصف نصف مصرع دونوں کے)

ان ریختوں کے لئے عام طور پر غزل کی ہئیت کو استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی مطلع ہے، قوافی اور ردیف کا التزام ہے۔ اور آخر میں مقطع ہے جس میں تخلص بھی لایا گیا ہے صرف ایک ریختہ مستزاد میں بھی ہے۔

چمکے تیرے پٹ اوٹ میں مکھ روپ اُجیارا
جیوں سس بدلی میں
بگذار کہ در روئے تو بینیم خدا را
اب سونی گلی میں
پھر ہنس چتون تیکھی سوں، بان چلایا

---

[1] دِل

عشقیؔ کے ہیئے[1] پر

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را

کھنجن کی تھلی ہیں

۱۷۰۰ء تک ریختہ کی شکل میں کھڑی بولی کے ادبی ارتقا کا آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن برج بھاشا کی ادبی اہمیت ابھی تک مسلم تھی۔ اس لئے شاہ ہیمیؔ نے بھی فارسی کے بعد برج بھاشا ہی کو زیادہ تر اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اور کبت اور دوہے عام طور پر اسی میں لکھے ہیں۔ ان کے کلام کے لسانیاتی تجزیے سے یہ بات بھی مسلّم ہو جاتی ہے کہ فارسی عروض صرف ریختے سے مخصوص تھا۔ یعنی ریختہ صرف ملی جلی زبان کا نام ہی نہیں تھا بلکہ اس ملی جلی زبان کے لئے فارسی عروض کے استعمال کی شرط بھی لازم تھی۔

غرض کہ اٹھارویں صدی کے آغاز تک "زبانِ دہلوی" نے ایک طرف برج کو زبان کے اکھاڑے سے نکال باہر کیا اور دوسری طرف بدیسی فارسی کو پچھاڑ لیا۔ اس سلسلے میں اُردو کے ارتقا کو سب سے زیادہ مہمیز اس ربط ضبط سے ملی جو اورنگ زیب کی فتوحات دکن کے بعد "شاہ جہاں آباد" اور "دولت آباد" کے درمیان پیدا ہوا۔

سترھویں صدی کے اواخر ہی سے ہندوستان کے فارسی شعرا نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ "ریختہ" کا ارتقا ادبی سطح تک ہو چکا ہے۔ اور اس کے ادبی استعمال کو اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہریانے کے علاقے میں ادبی تحریک پیدا ہوئی، اور لوگوں نے درس و تدریس کے لئے نصابی کتب[2] اور

---

[1] دِل

[2] منظوم لغات کی تحریک ہریانہ میں شاہ جہاں کے عہد میں بہت زور پکڑ جاتی ہے۔ شیرانی کی تحقیقات کے مطابق خالق باری اسی سلسلے کی پہلی کڑی ہے جس کا سنہ تصنیف ۱۶۲۱ء ہے۔

لغات پر توجہ کی۔ دیسی زبان کے فروغ و ترقی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہلِ علم فارسی کی بجائے اپنی مادری زبان کی طرف مائل ہونے لگے۔ میر عبدالواسع ہانسوی نے "غرائب اللغات ہندی" جو اُردو کی پہلی لغت ہے، اسی تحریک سے متاثر ہو کر "فائدہ عام" کے لئے لکھی دیباچے میں وجہ تصنیف بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"ہر چند ایں ہیچ مداں را لیاقت ترتیب و قابلیت تالیف نبود لیکن کثرت الحاح جمیع کثیر از اصحاب و فرط اقتراح جم غفیر اولی الالباب باعث براں شد کہ اسماء غیر مشہورہ و اشیاء موفورہ و الفاظ غیر مانوسہ معانی بین الانام مذکورہ را بعبارات واضحہ و اشارات لائحہ بیان نماید تا فائدہ آں عام و نفع آں تام باشد۔"[۱]

"فائدہ عام" کا یہ تصور شہر دہلی میں نہیں بلکہ مضافات دہلی میں تحریک کی شکل پہلے اختیار کرتا ہے۔ شہر دہلی میں لوگوں کی توجہ اُردو کی طرف سنجیدگی سے اس وقت منعطف ہوئی جب "باشندگان دکن" جوق در جوق اپنے ادبی سرمائے کو لے کر دہلی پہونچے"۔ اس زمانے میں دکن کے جو اُردو شاعر شمال گئے ان کی تعداد میں (جیسے جیسے اُردو کے تذکرے دستیاب ہوتے جا رہے ہیں) اضافہ ہوتا جاتا ہے[۲]۔ دکن کی بے شمار اردو کتابیں بھی شمالی ہند پہونچیں۔ بالخصوص ولی کے دیوان (۱۷۱۹ء) نے دہلی میں ایک ادبی آگ سی لگادی۔ حاتم اور دوسرے اساتذہ متقدمین نے ان کی استادی کا اعتراف کیا اور ان کی زمینوں میں غزلیں لکھیں۔ اس میں شک نہیں کہ دلی سے قبل ہی شمالی ہند میں اُردو زبان میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا، اور عہدِ اورنگ زیب کے اکثر فارسی شعرائے ریختہ گوئی

---

[۱] مقدمہ "نوادر الالفاظ" : مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ

[۲] ہندوستانی لسانیات : زور ص۱۱۳ مصحفی نے اپنے تذکرہ میں دکن کے ایسے پندرہ شاعروں کا ذکر کیا ہے۔ اور تمیں شمالی ہند کے ایسے شاعروں کا جو دکن گئے تھے۔

بھی شروع کر دی تھی۔ ان میں مرزا معز موسوی خاں فطرت، شاہ سعد اللہ گلشن، مرزا بیدل اور خان آرزو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ (بلکہ نواب صدر الدین محمد خاں فائز نے اپنا دیوان اردو ۱۷۱۵ء ہی میں مرتب کر لیا تھا)[1] لیکن ان تمام شواہد کے باوجود "اورنگ آبادی" دکنی کے ادبی اثرات متقدمین شعرائے دہلی پر مسلّم ہیں۔

دکن سے قطع نظر دہلی کا ربط ضبط اس عہد میں اکبر آباد (آگرہ) سے بھی گہرا رہا ہے۔ اور اس طرح زبان دہلوی کا بلا واسطہ برج سے بھی تعلق رہا ہے۔ شاہ جہاں نے ۱۶۴۷ء میں دہلی کو تقریباً دو سو سال کے بعد پھر دار السلطنت بنایا۔ سترھویں صدی کے نصف آخر اور اٹھارویں صدی کے شروع میں ہر قسم اور پیشے کے لوگ، جن میں صاحبان علم و فن بھی شامل تھے۔ آگرہ سے دہلی منتقل ہوتے رہے۔ صرف میر کے تذکرہ نکات الشعراء سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر آباد کے تیرہ شاعر (خان آرزو۔ آبرو۔ مضمون۔ پیام۔ سجاد۔ ثاقب۔ شوق۔ انسان۔ عارف۔ بہار۔ نثار۔ محسن) وہاں سے دہلی آئے اور پھر دہلی کے ہو رہے۔ خود اپنے متعلق میر صاحب رقمطراز ہیں۔

"فقیر حقیر میر محمد تقی میر مولف ایں نسخہ متوطن اکبر آباد است۔ بسبب گردش لیل و نہار از چندے در شاہجہاں آباد است۔"

اور میر صاحب کے برجی لہجہ کی شہادت انشاء اللہ خاں نے دی ہے:۔

"اس بحث سے میرا عندیہ یہ نہیں ہے کہ اردو کے فصیح تر شعرا یعنی مرزا رفیع دہلوی مرحوم اور میر صاحب عالی قدر میر محمد تقی صاحب کی شان کو گھٹایا جائے اگر موخر الذکر

---

[1] پروفیسر مسعود حسن رضوی نے فائز کی اولیت کو قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن جب تک فائز اور ولی کی ہم طرح غزلوں کا مسئلہ روشنی میں نہیں آجاتا فائز کی اولیت مشتبہ رہے گی (باقی صفحہ ۱۷۲ پر)

آگرہ میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہاں کا لہجہ اور 'برج' اور گوالیار کے الفاظ گفتگو میں لے آتے ہیں۔" (دریائے لطافت)

بعد کے کسی باب میں ہم نے اس بات کا تفصیل سے تذکرہ کیا ہے کہ خان آرزو نوادر الالفاظ میں برج یا گوالیاری کو کس لئے" افصح السنہ ہند" مانتے ہیں۔ اور عبدالواسع کی گنوارو بولی (ہریانی) کے مقابلے میں سند برج سے کیوں لیتے ہیں۔

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ برج کے علاقے سے جس قدر شاعر دہلی آئے وہ ریختہ گو تھے۔ دراصل ۱۷۰۰ء تک برج کے علاقے کے تمام شہروں (بالخصوص آگرہ) اور قصبات میں "زبان دہلوی" کا محاورہ پھیل چکا تھا۔ خاص طور پر اُن شہروں کے مسلمان باشندے اور وہ غیر مسلم بھی جو کسی نہ کسی طرح مسلم دربار یا روسا سے وابستہ تھے اسے بول چال میں استعمال کرتے تھے۔ اس لئے ۱۷۰۰ء کے آگرہ کی شہری آبادی بہ اختلاف تلفظ اور مقامی محاورہ عام طور پر اُردو بولتی تھی۔

اس عہد کے شہر دہلی کی مکمل لسانیاتی تصویر ہمیں انشاء اللہ خاں کی دریائے لطافت (۱۸۰۲ء) میں ملتی ہے۔ انشا کی تحریر سے یہ بار بار مترشح ہوتا ہے کہ دہلی کے مختلف طبقات اور مختلف محلوں میں زبان بدلی ہوئی پائی جاتی ہے۔ کہیں پنجابی کا محاورہ غالب ہے تو کہیں برجی لہجہ۔ میر عفر غینی ایک طرح سے بولتے ہیں۔ اور چنیا مل دلال دوسری طرح۔ غیر مسلموں کے بارے میں انشا یوں رقمطراز ہیں۔

(صفحہ ۱۷۱ سے آگے) یہاں یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ولی نے ابو المعالی کی معیت میں ۱۷۰۰ء میں دہلی کا سفر کیا تھا۔ دہلی کے ادبی حلقوں پر ان کے اثرات کا سلسلہ ۱۷۰۰ء سے شروع ہوتا ہے۔

"یہ لوگ جو شاہجہاں آباد میں رہتے ہیں دو گروہوں پر منقسم ہیں یعنی بعضوں کو مسلمانوں کی صحبت ملی اور بعضوں کو نہیں" اس کے بعد 'دیا' 'کرپا' 'اچھا' اور گراس (لقمہ) وغیرہ ہندی الفاظ کا ذکر کرتے ہیں، جو دوسری قسم کے لوگوں میں عام مستعمل ہیں۔[1]

انشا کو شہر دہلی اور مضافات دہلی کی زبان کے اختلافات سے بھی واقفیت تھی۔ اور ان کے کانوں کو "پرانی دلی" تک کا محاورہ (ایدھر۔ اودھر۔ کیدھر۔ پر دٹھا دپراٹھا) ناگوار تھا۔ دہلی کے اس لسانیاتی انتشار میں انشاء اللہ خاں "اُردو کی سند" کے دو معیار مقرر کرتے ہیں۔

(۱) "بادشاہوں اور امرا اور ان کے درباریوں اور حاضر باشوں سے اُردو کی سند لینی چاہیے۔ کیوں کہ فقیہ اور شاعر، ریاضی داں اور محاسب، مغنی اور طبیب صوفی اور خوبصورت عورتیں ان کی مجلس میں حاضر رہتے ہیں۔"

(۲) "وہ مقامات جہاں فصیحوں کا مجمع ہے یہ ہیں! قلعہ مبارک بادشاہی اور دو محلے اور ایک بنگلہ سید فیروز...... جس میں شک کی گنجائش نہیں وہ یہ مقام ہیں یعنی ملکہ آفاق کی حویلی تک ...... اور چتلی قبر سے ترکمان دروازہ تک ایک طرف اور دہلی دروازے تک (جسے دلّی دروازہ کہتے ہیں) دوسری طرف۔ اور پھر چوک سعد اللہ خاں تک اور نواب امیر خاں مرحوم کا بازار اور حویلی اور سہ راہہ بیرم خاں جو تراہہ کے نام سے مشہور ہے اور محلہ فولاد خاں اور کوچہ چیلاں جو دلّی دروازہ کا ایک حصّہ ہے۔"

---

[1] دریائے لطافت صہ ۲۰

انشاء نے اُردو کی سند کے جو معیار مقرر کئے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں۔ ہمارے قدیم سماج کا تہذیبی اور لسانیاتی معیار ہمیشہ اس دس فیصدی آبادی نے متعین کئے ہیں جو امرا اور روسار، اور متعلقہ صنّاع اور اہلِ فن پر مشتمل ہوتی تھی۔ جمہوریت کے اس عام تعلیم کے تصوّر کی غیر موجودگی میں جو آج زبان کے متعین کرنے کا سب سے بڑا آلہ کار ہے۔ سندی زبان کا معیار صرف "منتخبِ روزگار" کیا کرتے تھے۔ اٹھارویں صدی میں اُردو کا ارتقا اُنہیں لوگوں کا مرہونِ منت ہے۔ اس طبقہ میں عوامی بولیوں کے اثرات نہایت آہستہ آہستہ پہونچتے تھے۔

ابتدائے اٹھارویں صدی کی اُردو زبان پر سب سے اہم تصنیف اس عہد کے سب سے بڑے عالم اور اُردو کے پہلے ماہر لسانیات خان آرزو (۱۶۸۹ تا ۱۷۵۵ء) کی لغت "نوادر الالفاظ" ہے[1]۔ خان آرزو کے پیش نظر حسب ذیل زبانیں اور بولیاں تھیں جن کا حوالہ لغتِ مذکورہ کے متن میں جابجا ملتا ہے۔

(۱) زبان وطن صاحب رسالہ (میر عبدالواسع کی زبان یعنی ہریانی)۔
(۲) ہندی کتابی (سنسکرت)، (۳) گوالیاری یعنی برج (۴) ہندی راجپوتنی (راجستھانی)، (۵) کشمیری یا ہندی کشمیری (۶) ہندی پنجاب یا زبان مردم پنجاب (۷) زبانِ اُردو یا اُردوئے معلیٰ یا زبان شاہجہان آباد یا اصطلاح شاہ جہان آباد یا اہلِ اُردو یا ہندی فصحا[2]۔

اس سلسلہ میں ان کے نزدیک سندی محاورہ برج یا گوالیاری کا ہے۔ اس کے

---

[1] مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ : ۱۹۵۱ء (کراچی)
[2] ایضاً : صہ ۳

بعد زبان اُردو یا اصطلاح شاہ جہاں آباد کو وہ اہمیت دیتے ہیں۔ بالخصوص وہ زبان جس میں بادشاہ اور امراء سلاطین تکلّم کرتے تھے اور جو شہری ہونے کی حیثیت سے میر عبد الواسع کی قصباتی زبان کے مقابلے میں افصح تھی۔ یہی وہ زبان تھی جسے آرزو متاخرین "زبان مقرر" کہتے ہیں۔

خان آرزو کی اس لغت سے اُردو زبان کے معیار اور اُس کی اصلاح کے حسب ذیل اصول متعین ہوتے ہیں۔

(۱) عربی فارسی الفاظ کی صحت۔

غرائب اللغات (اصل لفظ)	نوادر الالفاظ (تصحیح)
رَوش (بروزن ہوش)	رَوِش
بیرکھ	بیرق
زچا	زچا
کلابا	قلابہ
ریحل	رحل
آفتاوا	آفتابہ
پجاوا	پژاوہ
کیف	قیف
چرکھی	چرخی
چاکو	چاقو

صوتیات کے نقطۂ نظر سے اُردو زبان کے ارتقا میں یہ تحریک خاص اہمیت

رکھتی ہے۔ یہ قصباتی اور عوامی صوتیاتی میلانات کے خلاف شہری اور علمی ردِ عمل تھا جس نے (ق)، (ز)، (خ) اور (د) کی صحت تلفظ پر زور دیا۔ اس قسم کا صوتیاتی توڑ مروڑ صرف نواح دہلی کی خصوصیت نہیں تھی۔ بلکہ دکن میں صوتیاتی تبدیلیاں اس سے پہلے رونما ہو چکی تھیں۔ یہاں (ق) کی آواز قابلِ ذکر ہے۔ جو ہندوستانی زبانوں میں اُردو سے مخصوص ہے اور جسے اہل پنجاب ادا کرنے سے قاصر ہیں۔ خان آرزو کا اس کی ادائیگی پر زور دینا اس بات کی دلیل ہے کہ لاہوری اور دہلوی لہجہ میں صوتیات کے نقطۂ نظر سے جو فرق تھا اُسے اس عہد کے اہل علم محسوس کرتے تھے۔

(۲) (ڑ) اور (ڈ) کی آوازیں۔

جدید اُردو میں (ڑ) اور (ڈ) کی تقسیم پر آخری باب میں روشنی ڈالی گئی ہے قدیم اُردو میں صرف (ڈ) کی آواز ملتی ہے۔ (ڑ) کی آواز اٹھارویں صدی کی ابتدا کا ارتقا ہے۔ (ڈ) کی آواز آج بھی پنجابی، راجستھانی، ہریانی اور کھڑی بولی کے بعض اضلاع (میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور) میں عام مستعمل ہے۔ گو معیاری اردو میں (ڑ) کی آواز خاص خاص مواقع پر ادا کرنا شائستگی کی علامت سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً

بڈا (کھڑی بولی)	بجائے	بڑا
ٹھڈی (کھڑی)	بجائے	ٹھوڑی
گڈھا (کھڑی)	بجائے	گڑھا
علی گڈھ (کھڑی)	بجائے	علی گڑھ

برجی لہجہ میں (ڑ) پر (ر) کو ترجیح دی جاتی ہے۔ نوادر الالفاظ میں میسر

عبدالواسع ہانسوی کے متتبع میں

اساڑھ	کو	اساڈھ
بڑھبس	کو	بڈھبس
بھیڑ	کو	بھیڈ
پیڑو	کو	پیڈو
بڑھنا	کو	بڈھنا

لکھا گیا ہے۔ اس کی توثیق محض اندراج تلفظ ہی سے نہیں بلکہ لفظوں میں حروف کی ترتیب سے بھی ہوتی ہے۔

لیکن جیسا کہ قبل مذکور ہو چکا ہے اٹھارویں صدی تک (ڑ) کی آواز مستقل طور پر اُردو میں جگہ بنا چکی تھی جس کا ثبوت نوادر الالفاظ کے وہ بے شمار الفاظ ہیں جن میں (ڈ) کی بجائے (ڑ) آئی ہے۔ (ڑ) کی آواز کا تعین اُردو صوتیات کے ارتقا میں ایک اہم نشان ہے۔

"نوادر الالفاظ" میں (ڑ) والے الفاظ :۔

اڑو۔ اگاڑی۔ اکھاڑا۔ اوکھڑنا۔ انگڑائی۔ ایڑی۔ باڑ۔ بھڑوا۔ بھڑبھونجا۔ بڑ۔ پھاوڑا۔ پاپڑ وغیرہ۔

(۳) برج سند کے تحت اکثر ایسے الفاظ میں الف زائدہ اور واؤ زائدہ پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس پنجابی ہریانی اور دکنی کا عام رجحان تخفیف حروف علت کی طرف ہے۔ مثلاً

باندر	بجائے	بندر
باندھ	بجائے	بند

بجاؤنا	بجائے	بجانا
پھوکنی	بجائے	پھکنی
ساتو	بجائے	ستو
تاپ	بجائے	تپ

صوفیا کے قدیم ترین ملفوظات میں ان میں سے بعض الفاظ حسبِ ذیل شکل میں ملتے ہیں۔

ڈرا (خیر المجالس) ۔ تپ (خیر المجالس)

چنانچہ نوادر الالفاظ سے یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ دہلی میں فارسی و عربی الفاظ کی صحت اور املا پر شروع سے زور دیا گیا۔ چنانچہ اس سلسلے میں انھوں نے اہلِ دکن کی اِن لسانیاتی بدعتوں کو قبول نہیں کیا جن کے تحت انھوں نے عربی فارسی الفاظ کو توڑ مروڑ کر سہل بنا لیا تھا۔ البتہ اس زمانے کے زباں داں ابھی تک اس بارے میں متفقین نہیں تھے کہ نواحِ دہلی کی بولیوں کی کثرت کے درمیان وہ معیاری زبان کی وحدت کس طرح تلاش کریں۔ خان آرزو اپنی گوالیاری نسبت کی بنا پر گوالیاری (برج) کو "افصح السنہ ہندی" تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ "اصطلاح شاہ جہان آباد" اور "زبانِ اردوئے معلیٰ" کے محاورے پر نظر رکھتے ہیں۔

مظہر جانجاناں، حاتم اور بعد کے دیگر مصلحین زبان خان آرزو کی سی علمیت اور زباں دانی کے مالک نہیں تھے۔ چنانچہ انھوں نے قلعہ شاہی اور روسا و امرا کے حلقوں کی سند چاہی۔ چنانچہ حاتم نے جب (۱۷۵۵ء) میں اپنی قدیم کلیات

سے "رطب و یابس" نکال کر "دیوان زادہ" مرتب کیا تو اصلاح و معیار زبان کے حسبِ ذیل اصولوں کو پیشِ نظر رکھا۔

(۱) "بقول شاہ مبارک آبرو ؎

وقت جن کا ریختے کی شاعری میں صرف ہے
اون ستی کہتا ہوں بوجھو حرف میرا ژرف ہے
جو کہ لاوے ریختے میں فارسی کے فعل و حرف
لغو ہیں گے فعل اُس کے ریختے میں حرف ہے"

(۲) "لسان عربی و زبان فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشد ......

(۳) "...... و روزمرۂ دہلی کہ مرزایان ہند و فصیحان اندور محاورہ دارند منظور داشتہ ......"

(۴) "...... زبان ہر دیار تا بہ ہندوی کہ آنرا بھاکھا گویند موقوف کردہ ......

(۵) "...... محض روزمرۂ عام فہم کہ پسند خاص بود اختیار نمود"

مذکورہ بالا خود ساختہ اصولوں کے تحت حاتم نے جو مثالیں دی ہیں۔ وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) عربی فارسی الفاظ کی صحت۔

تسبی	کو	تسبیح
صحی	کو	صحیح
بگانہ	کو	بیگانہ
ددانہ	کو	دیوانہ
مَرَض	کو	مرَض

غَرَض   کو   غرَض

(۲) الفاظ ہندی :-

"نیں و جگ و ہِت و بہر" یا "لفظ مار و موا و ازیں قبیل"

کو ترک کیا۔

حروف میں :-

	سے	بجائے	ستی
	اُدھر	بجائے	اُودھر
	کدھر	بجائے	کیدھر "کہ در آں زیادتی حرف باشد"
یا :-	پہ	بجائے	پہ
	یہاں	بجائے	یاں
	وہاں	بجائے	واں "کہ در مخرج تنگ بود"

(۳) رائے فارسی (ر) کا رائے ہندی (ڑ) کے ساتھ قافیہ کرنا۔ مثلاً "گھوڑا و پورا"۔ دھڑ و سر و مانند آں ......"

(۴) "..... مگر ہائے ہوز را بدل کردن بہ الف کہ عام تا خاص در محاورہ دارند بندہ دریں امر بمتابعت جمہور مجبور است۔ چنانچہ

بندہ	را	بندا
پردہ	را	پردا

و آنچہ ازیں قبیل باشد وایں قاعدہ را تا کجا شرح و ہر غرض کہ خلاف محاورہ وغیرہ مصطلح و غلطی روزمرہ و نقصان فصاحت را دخل نہ باشد"

غرضنکہ اٹھارویں صدی کے نصف اوّل اُردو زبان کی صحت کے وہ تمام اصول مرتب ہو چکے تھے جن پر سختی کے ساتھ عمل انیسویں صدی کے ابتدا میں شروع ہوا۔ اس وقت کے شعرا کا لسانی شعور 'متروکات' کی شکل میں نمایاں ہوتا تھا۔ ان متروکات کا تجزیہ کیا جائے تو ان کی تہ میں وہی اصول ملیں گے جن کی طرف سب سے پہلے اشارہ خان آرزو نے کیا اور بعد کو مظہر، حاتم اور دیگر مصلحینِ زبان نے عمل کیا۔

(۱) 'بھاکھا' (دیسی الفاظ) کے لفظوں کا ترک کرنا۔ اور عربی فارسی الفاظ کا ان کی جگہ لینا۔ مثلاً

اسماء :-			
	نین	بجائے	چشم
	کال	"	مصیبت
	پگ	"	پگڑی
	ساجن	"	معشوق
	جگ	"	دنیا
	درشن	"	زیارت
	ماس	"	گوشت
	منسا	"	تجویز
	موہن	"	معشوق
	ہیو	"	دوست، یار
	پیا	"	معشوق
	برہا	"	فراق

من	〃	دِل
سنسار	〃	دنیا
برت	〃	غیر
باٹ	〃	رستہ
درس	بجائے	دیدار
دارو	〃	دوا
پیتم	〃	معشوق
سریجن	〃	معشوق
سُرج	〃	سورج
جیو	〃	جی
بجلی	〃	بجلی
جھٹا	〃	جھوٹا
چند	〃	چاند

حروف :-

نمن	〃	طرح
بھیتر	〃	اندر ؛ میں
نا	〃	نہ ؛ نہیں
سیں، سوں، سیتی	〃	سے
انگے	〃	آگے

بنا 〃 بن

باج 〃 بغیر

مینس ۔ منے 〃 میں

دوج ۔ دوجا 〃 دوسرا

لگ بجائے تک

کن 〃 پاس

کوں 〃 کو

نزیک ۔ نزک 〃 نزدیک

کدھی ۔ کدھیں 〃 کبھی

اتا 〃 اتنا

نہیں 〃 نہیں

افعال —

تجنا 〃 چھوڑنا

اتھا 〃 تھا

اچھے 〃 ہے

کیتا 〃 کیا

جالے 〃 جلائے

کینی 〃 کیا

بوجھنا 〃 سمجھنا

گلنا	"	پگھلنا

اسمائے ضمیر :-

کئی	"	کوئی
آپس	"	اپنے
یہ	بجائے	اس
تمنا	"	تمہارے[1]

یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ متقدمین کی اصلاح زبان کی تحریک دکنی محاورہ کے خلاف نہیں تھی جیسا کہ عام خیال ہے[2] ولی ایک ادبی تحریک کے میر کارواں تھے لسانی تحریک کے نہیں۔ بلکہ شاہ گلشن کا مشورہ اگر مستند ہے تو انہوں نے ریختہ کو "موافق اردوئے معلّیٰ شاہ جہاں آباد" کیا۔ متروکات کی فہرست دراصل ان الفاظ اور قواعد کے قاعدوں سے تعلق رکھتی ہے جو قدیم دہلی میں رائج تھے اور جنھیں متقدمین نے اپنے عہد کے محاوروں کے موافق نہیں پایا۔ تمام اٹھارویں صدی میں متروکات کا عمل جاری رہا لیکن ہر مقام پر سند کے لئے "دلّی وال" کی زبان ہی پیش کی جاتی تھی جس پر شہادت اٹھارویں صدی کے دوسرے بڑے ماہر لسانیات انشاء اللہ خاں نے اپنی تصنیف "دریائے لطافت" میں دی ہے۔

---

1. تذکرہ جلوہ خضر : صفیر بلگرامی
2. ہندوستانی لسانیات : ڈاکٹر زور ص ۱۱۹

چوتھا باب

تقابلی مطالعہ: برج بھاشا، پنجابی اور دکنی

اُردو برج بھاشا سے نہیں نِکلی

ہمارے یہاں لسانی تحقیق کے مردِ میدان آزاد ہیں، جنہوں نے سب سے پہلے آبِ حیات میں اُردو زبان کی تاریخ کو سلسلہ وار بیان کرنے کی کوشش کی ہے، آزاد شمالی ہند کی بولیوں کے باریک اختلافات سے ناواقف تھے۔ اس لیے انہوں نے اُردو کا ماخذ برج بھاشا کو بتایا۔ آبِ حیات کا پہلا جملہ یہ ہے۔

"اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے۔ اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے"۔

برج بھاشا جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے شورسینی اَپ بھرنش کی سچی جانشین ہے، لیکن وہ کھڑی بولی کی ماں نہیں بہن ہے، زبان کے معنوں میں لفظ برج (سنسکرت: وِرج: جانوروں کا باڑہ یا چراگاہ)، بہت بعد کو استعمال ہوا ہے۔ بقول ڈاکٹر دھیریندر ورما سب سے پہلے بھکاری داس نے "کاویہ نرنئے" (سمبت ۱۹۰۳) میں استعمال کیا ہے۔[۱]

---

[۱] برج بھاشا ویاکرن صفحہ ۱۰ لیکن ڈاکٹر موصوف کی یہ تحقیق صرف ہندی ادبیات تک محدود ہے۔ خانِ آرزو اپنی تصحیح غرائب اللغات ہندی اور مرزا خاں اپنی تحفتہ الہند میں لفظ "برج" ایک مخصوص زبان کے معنوں ہی میں استعمال کرتے ہیں۔ مرزا خان کی تحفتہ الہند (۱۶۷۵ء) برج بھاشا کی پہلی قواعد ہے جو پروفیسر ضیاء الدین نے مرتب کر کے شانتی نکیتن بنگال سے شائع کی ہے۔

اُردو کا ڈھانچہ برج بھاشا پر تیار نہیں کیا گیا ہے۔ قدیم اُردو جمنا پار کی ہریانہ بولی سے قریب تر تھی۔ جدید اُردو اپنی صرف و نحو کے اعتبار سے مراد آباد اور بجنور کے اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے۔ برج بھاشا نے بعد کو اُردو کا معیاری لب و لہجہ متعین کرنے میں ضرور مدد دی ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ سکندر لودھی کے عہد سے لے کر شاہجہاں کے زمانے تک آگرہ ہندوستان کا پایۂ تخت رہا ہے۔

(۱) اُردو اور برج بھاشا (قدیم و جدید دونوں) میں بعض صوتی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ مغربی ہندی کی پانچ بولیوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) [اُو یا اَو] والی بولیاں: برج بھاشا: قنوجی اور بندیلی

(ب) [اَ] والی بولیاں: کھڑی بولی: ہریانی

برج بھاشا میں اسی لئے اسماء و افعال اور اسمائے صفات کے آخر میں ایک واؤ مجہول اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً۔ اپنو (اپنا) چلیو (چلا) گھوڑو (گھوڑا)، بڑو (بڑا)۔

(۲) مغربی ہندی کی نمبر (ب) بولیاں (اے) اور (او) حروفِ علت کو ترجیح دیتی ہیں۔ برج بھاشا میں (اَے) اور (اَو) آتے ہیں۔ جدید اُردو کا معیاری لہجہ برج بھاشا کا تتبّع کرتا ہے۔ مثلاً کھڑی بولی (دیہات) پیسہ برج بھاشا اور اُردو: پَیسہ۔ اِسی طرح ہے اور ہَے۔ میں (واحد متکلم) اور مَیں۔

(۳) ہریانی کھڑی بولی اور پنجابی (جدید و قدیم) [ڑ] اور [ڑھ] آوازوں پر (ڈ) اور (ڈھ) آوازوں کو ترجیح دی جاتی ہے۔ پنجابی میں تو (ڑھ) کی آواز معدوم ہے[1]۔ قدیم اُردو اور دکنی اس اعتبار سے ہریانی کی پیروی کرتی ہیں۔ مثلاً چڈھنا[2] (ف۔ ش۔ ر) جھنڈا گڈا یا دگڑ ایا۔

---

[1] پنجابی اور ہندی کا بھاشا وگیان: دونی چند: صفحہ ۷۴

[2] ہندی بھاشا کا اِتی ہاس: دھیریندر ورما: صفحہ ۱۶۴

بارہ ماسہ افضل نمونہ پنجاب میں اُردو)۔

آج بھی ہریانہ اور کھڑی بولی کے علاقوں میں گڈّی (سہارن پور) بڈا (کرنال)۔
چھاڈ (ضلع دہلی) چڈھنا (ضلع دہلی) بولے جاتے ہیں (ڈ) اور (ڈھ) آوازوں کے متعلق یہ
حکم لگانا کہ یہ پنجابی سے لی گئی ہیں ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے ارتقا سے متعلق ناواقفیت
کا ثبوت دینا ہے۔ (ڑ) اور (ڑھ) کی آوازیں دراصل (ڈ) اور (ڈھ) کی آوازوں ہی کی
ارتقائی شکلیں ہیں۔ یہ ارتقا عہدِ پراکرت میں ہوا ہے۔ یہ آوازیں جب کسی لفظ کے اندر
واقع ہوتی ہیں۔ تو عام طور سے (ڑ) اور (ڑھ) میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ دکنی[3] کے مذکورہ بالا
الفاظ (بڈا۔ چڈھنا وغیرہ) میں اسی پراکرتی رجحان سے انحراف ملتا ہے۔ جو موجودہ پنجابی‘
ہریانی اور کھڑی بولی تک میں پایا جاتا ہے۔ لیکن لسانی ارتقا کے اصولوں کے زور پر رفتہ
رفتہ (ڑ) اور (ڑھ) کی آوازیں زیادہ شستہ خیال کی جانے لگیں۔ اسی لئے برج بھاشا کی
طرح جدید اُردو اور ہندی میں (ڈ اور ڈھ) جب لفظ کے درمیان آتے ہیں تو عام طور سے
(ڑ اور ڑھ) میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً :-

اُردو اور برج	دکنی	ہریانی اور کھڑی بولی
بڑھانا	بڈھانا (ف۔ق۔م)	بڈھانا
بڑائی	بڈائی 〃	بڈائی (نمونہ محبوب عالم؛ پنجاب میں اُردو)
پڑھنا	پڈھنا 〃	پڈھنا 〃 〃
چڑھنا	چڈھنا 〃	چڈھنا
چھوڑا		چھاڈا (ہم چھاڈا بھاری پتھر محاورہ زٹلی از پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۹۸)

3؎ ف ؛ فرہنگ : ق۔م ؛ قطب مشتری ؛ س۔ر ؛ سب رس ؛ ش۔پ ؛ شہ پارے۔
مرتبہ ڈاکٹر زور۔

لیکن دکنی میں پڑنا (پڑھنا) اور چڑنا (چڑھنا دیکھئے ف. ش. ر) بھی آیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ دکنی میں (ڑھ) کی آواز پنجابی کی طرح کالعدم نہیں بلکہ ہریانی زبان کے مانند گاہ گاہ پائی جاتی ہے۔

اس کے بعد پروفیسر شیرانی کے اس قسم کے لسانی نوٹ کس قدر بے سروپا معلوم ہوتے ہیں کہ:۔

"اردو کی ڑ ہریانی میں ڈ سے بدل جاتی ہے۔" (پنجاب میں اردو صہ ۱۹۱)

جدید اردو میں (ڈ)، (ڈھ)، ڈّ (مشدد) اور (نڈ (غنہ کے ساتھ)) اور (ڑ) (ڑھ) (ڑّ (مشدد)) اور (نڑ (غنہ کے ساتھ)) کا استعمال حسب ذیل جدول کے مطابق پایا جاتا ہے۔

	لفظ کی ابتدا	لفظ کے درمیان	لفظ کے آخر میں
ڈ	✓	×	×
ڈھ	✓	×	×
ڈّ (مشدد)	×	✓	×
نڈ (غنہ کے ساتھ)	×	✓	✓
ڑ	×	✓	✓
ڑھ	×	✓	✓
ڑّ (مشدد)	×	×	×
نڑ (غنہ کے ساتھ)	×	×	✓

اشارے: (۱) ڈ صرف لفظوں کے شروع میں ملتا ہے اور ڑ سے کوئی لفظ شروع

نہیں ہوتا۔

(۲) لفظ کے درمیان میں ڈ صرف لفظ "گڈریا" میں پایا جاتا ہے۔ بولیوں میں یہ بھی بدل کر "گڑڑیا" ہو جاتا ہے۔

(۳) لفظ کے درمیان میں ڈ صرف مرکب الفاظ میں ملتا ہے۔
مثلاً نِڈر (نِ + ڈر)۔ سڈول (س + ڈول)۔ ڈانواں ڈول۔ ڈبڈبائی (ڈب + ڈبائی)۔

(۴) لفظ کے آخر میں ڈ ہمیشہ غنہ کے ساتھ آتا ہے۔ مثلاً رانڈ۔ سانڈ۔ البتہ انگریزی کے الفاظ (مثلاً روڈ۔ بورڈ۔ کارڈ وغیرہ) اس قاعدے سے مستثنیٰ ہیں۔ ان کے علاوہ پراکرت کے کچھ ایسے الفاظ بھی ہیں جو درحقیقت مشدد ڈ رکھتے ہیں لیکن جو اُردو والوں نے غیر مشدد طور پر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً کھڈ۔ اُجڈ۔ لاڈ (جو لاڑ بھی بولا جاتا ہے)۔

(۵) ڈھ صرف الفاظ کے شروع میں ملتا ہے۔ درمیان میں یہ ہمیشہ ڈ کے ساتھ مشدد آتا ہے۔ مثلاً بڈّھا (ب + ڈ + ڈھ + ا)۔ لفظ کے آخر میں یہ ہمیشہ ڑھ بن جاتا ہے (علی گڈھ کی بہ نسبت علی گڑھ فصیح تر ہے)۔

(۶) ڑ اور ڑھ الفاظ کے شروع میں کبھی نہیں آتے۔

(۷) مشدد ڈ یا ڈ اور ڈھ کا فصیح تر تلفظ ڑ یا ڑھ کی شکل میں اکثر کیا جاتا ہے۔

بڈّھا	سے	بوڑھا
گڈّھا	سے	گڑھا
ٹھڈّی	سے	ٹھوڑی

اِن آوازوں کے لحاظ سے اُردو برج بھاشا اور پنجابی کا نہایت لطیف امتزاج

پیش کرتی ہے اور اس کا یہ رجحان ابتدا سے رہا ہے۔

اُردو اور برج بھاشا کے صرفی و نحوی اختلافات

ضمائر:-

(۱) متکلم واحد: برج بھاشا میں (میں) اور (ہوں) دونوں مستعمل ہیں۔ جدید ادبیات میں دونوں کا استعمال قریب قریب برابر ملتا ہے۔ البتہ قدیم میں "ہوں" زیادہ مستعمل تھا۔[۱] اُردو میں معدوم ہے۔ البتہ دکنی میں قلی قطب شاہ کی "ریختی" میں مل جاتا ہے ؎

پیارے نہ کر کھینچ ہوں تو پہ واری — ص ۶۲

ہوں تل تل تمن پر تھے واری ہو پیاری — ص ۶۳
کہ تن من جوبن آپ ہوں تو پہ واری

یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ کلیات میں "ہوں" صرف ریختی میں آیا ہے اس سے اس بات پر روشنی پڑتی ہے کہ یہ اس وقت تک متروک ہو چکا تھا لیکن چونکہ زنانخانے کی زبان بہت آہستہ بدلتی ہے اس لئے عورتوں کی زبان پر اس وقت تک جاری تھا۔ اس شعر میں "تو پہ" (تجھ پہ) بھی قابل ذکر ہے جو خالص برج ہے۔

"ہوں" پنجابی جدید و قدیم میں بھی ملتا ہے لیکن "میں" کے مقابلہ میں کم تر۔ گجراتی میں یہ "ہوُں" ہے۔

(۲) برج بھاشا کا (موُ) اور (موہیں) دکنی کا 'مجھ' اور اُردو کا 'مجھے' ہے۔ لیکن قلی قطب شاہ کی ریختیوں میں مو (میرا) اور (مجھ) کے معنوں میں بھی آیا ہے۔ (دیکھئے ریختی صفحہ ۶۱ و ۶۲)۔

---

[۱] برج بھاشا دیاکرن: دھیریندر ورما ص ۶۴

(۳) مخاطب واحد اور جمع : برج بھاشا میں 'تو' اور 'توں' کے ساتھ ساتھ "تیں" اور "تیی" بھی مستعمل ہیں جو اردو میں نہیں ملتے۔ برج بھاشا کے ضمائر مخاطب کے اندر مذکر و مؤنث کا بھی لحاظ رکھا جاتا ہے۔

'تیرا' اور 'تمہارا' (جو برج بھاشا میں 'تیرو' اور 'تمہارو' ہو جاتے ہیں) کے علاوہ ایک اور شکل "تہارو" بھی ملتی ہے جو راجستھانی کے زیر اثر برج نے قبول کی ہے۔ دکنی اور اردو میں یہ نہیں ملتی۔ البتہ دہلی کی موجودہ زبان کے محاورات میں مل جاتی ہے۔ جیسے :-

"تھارا ہاں سو مھارا ہاں 'مھارا ہاں سو ہیاں ہیں"

یعنی اپنے موقعہ پر "ہیں ہیں" کر کے ٹال جانا۔

ضمائر کی مزید شکلیں جو برج بھاشا سے مخصوص ہیں حسب ذیل ہیں :-

تائیں۔ توہی۔ توے۔ تیراؤ۔ تیراؤں۔ تمہوں۔ تمہائیں۔

موہی۔ موے۔ میراؤ۔ ہماؤں۔ ہمن (قدیم اردو میں ملتا ہے) ہمائیں۔ وہ (وہ کے لیے وہ دکنی میں ملتا ہے)۔ وس۔ وا۔ واہی۔ وائے۔ وِے (قدیم اردو اور دکنی میں جمع کے طور پر آیا ہے)۔ اُنی۔ اُن۔ انہاؤں۔ وِنی۔ وِن (دہلی اور میرٹھ کے اطراف میں بھی ان کے لیے آتا ہے)۔ انہائیں' ونہائیں۔

جون۔ جاسو۔ تاسو۔ جنھائیں۔ تنہائیں۔ کو (کون)۔ کاہی۔

(۴) برج بھاشا کے صوتی اصولوں کا ضمائر پر بھی اثر پڑا ہے۔ مثلاً :-

اُردو	تمہیں	برج :	تمہو	
اُردو	ہمارا	برج :	ہمارو	
اُردو	میرا	برج :	میرو	وغیرہ

(۵) اسمار کی جمع بنانے کے لئے اُردو میں "اوں" اور پنجابی میں "اں" لگاتے ہیں۔ برج بھاشا میں صرف "ن" کا اضافہ کرتے ہیں۔

اُردو : گھوڑوں پنجابی ، گھوڑاں دکنی : گھوڑاں

ہریانی : گھوڑاں برج بھاشا : گھوڑن

افعال :۔

(۱) اُردو میں مادہ کے اندر "تا" کا اضافہ کرکے فعل مضارع بنایا جاتا ہے۔ برج بھاشا میں "اَت" لگایا جاتا ہے۔ مثلاً کرت۔ پرت۔ جات وغیرہ اس کے علاوہ مذکر کے لئے ("تو") اور مؤنث کے لئے ("تی") کی شکلیں بھی لائی جاتی ہیں۔ مثلاً جاتو ہے۔ نہارتی (دیکھتی) ہے[۱]۔

افضل کے بارہ ماسہ اور شیخ محبوب عالم کی ہریانی تالیفات[۲] میں مضارع کی یہ شکلیں عام طور سے ملتی ہیں لیکن دکنی میں نہیں ملتی۔

(۲) اپنے (اُو) والے صوتی اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے برج بھاشا میں ماضی "مارا" یا "ماریا" نہیں ہوتا بلکہ "ماریو" یا "مارو" ہوتا ہے جیسا کہ بعض نے اشارہ کیا ہے، ماریا یا مارو ایک دوسرے سے ماخوذ نہیں۔

(۳) مستقبل، برج بھاشا میں (گو) یا (ہ) کی مختلف شکلوں سے بنتا ہے۔ جن میں (گو) کی بہ نسبت (ہ) کی شکل زیادہ عام[۳] ہے۔ مثالیں۔

---

[۱] برج بھاشا ویاکرن : دھیریندر ورما صفحہ ۱۰۰

[۲] دیکھئے نمونے پنجاب میں اُردو صفحہ ۱۸۶، اور اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۱ء "ہریانی زبان میں تالیفات" شیرانی

[۳] گریرسن : لسانیاتی تبصرۂ ہند : جلد نہم حصہ اول صفحہ ۷۲

چلوں گو   چلی ہوں

(نوٹ: عام طور سے (ہ) پوری ادا نہیں کی جاتی اس لئے چلی ہوں، محض "چلیوں" بن جاتا ہے)۔

شیرانی کا یہ خیال غلط ہے کہ "گو" کی علامت مستقبل برج بھاشا نے پنجابی یا اردو سے لی ہے[1]۔ برج بھاشا کے قدیم ترین نمونوں میں ہمیں "گو" کی شکلیں ملتی ہیں: (ہوں چلوں گو صفحہ ۱۶/۱) دیوں گو صفحہ ۲/۲، راکھیں گے صفحہ ۲۳/۱۴، ہوئے گو صفحہ ۲۴/۲ : از چوراسی ویشنوں کی وارتا: گوکل ناتھ: الہ آباد ۱۹۲۶ء)۔

(ہ ہس) سے ہوا مستقبل قدیم اردو (دکنی) میں کہیں نظر نہیں آتا۔

(۴) برج بھاشا کا مصدر بھی اردو سے مختلف ہے برج میں مصدر "بو" "دو" یا "نو" کے اضافے سے بنتا ہے۔ ہو بو۔ بوجھو و۔ چلنو۔ وغیرہ۔

(۵) افعال امدادی میں دونوں زبانوں کا اختلاف اور زیادہ نمایاں ہوجاتا ہے۔ زمانہ حال میں " ہ " کی مختلف شکلیں لگائی جاتی ہیں جو دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ صرف "ہوں" کا تلفظ برج میں "ہوں" ہوجاتا ہے[2] لیکن زمانہ ماضی میں فعل امدادی کی شکل بالکل مختلف ہے۔ اردو میں "تھا" کی مختلف شکلیں مستعمل ہیں۔ برج بھاشا میں "ہو" اور "ہتو" کی مختلف شکلیں آتی ہیں جو اردو ادبیات میں کسی عہد میں مستعمل نہیں ہوئیں۔ اسی وجہ سے برج بھاشا کے حال اور مستقبل میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

حروف

(۱) حروف میں کو۔ سے۔ میں اوپر دی ہوئی صوتی خصوصیات کے تحت۔ کو۔

---

[1] پنجاب میں اردو صفحہ ۱۰۷ [2] ضمیمہ گرامر ہندی: دھیریندر ورما: صفحہ ۱۱۶

سے ۔یں بن جاتے ہیں۔ ہریانی اور پنجابی میں "کو" کی بجائے "نون" ملتا ہے۔ کھڑی بولی کے بعض اضلاع میرٹھ، سہارن پور وغیرہ میں بھی یہ سُننے میں آتا ہے۔ لیکن دکنی اور برج میں "کو" ہی مختلف تلفظ (کُو۔ کو۔ کوں) کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ برج بھاشا کے قدیم ادبی نمونوں میں نیں، سوں، تیں، پے اور مانجھ۔ پاچھیں (پیچھے) سنگ، سم (طرح) بھی ملتے ہیں۔ جو قدیم اردو میں بھی مستعمل تھے لیکن بعض حروف ایسے بھی ہیں جنھیں اُردو نے کبھی منہ نہیں لگایا۔ مثلاً نکٹ (نزدیک)، سہت (ساتھ)، ہت (لئے)۔ نوں (دکنی میں لگ، ملتا ہے) یہ تمام حروف برج بھاشا میں قدیم زمانے سے مستعمل تھے۔[1]

لیکن اُردو اور برج کے مذکورہ بالا اختلافات کے باوجود سکندر لودھی کے زمانے سے لے کر شاہجہاں کے عہد (۱۶۴۸ء) تک اُردو کے ارتقا میں اس کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اُردو زبان کی تاریخ میں دہلی سے آگرہ کو دارالسلطنت کے انتقال اور اُس کے اثرات کا متعلق ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ ہمارے خیال میں قدیم اُردو کی اکثر گتھیاں اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھنے سے کھل جائیں گی کہ تقریباً دو سو سال تک ہندوستان کا دارالسلطنت برج بھاشا کے علاقہ میں (آگرہ) رہا ہے۔ تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے یہ دو سو سال ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ میں اہم ترین ہیں۔ چنانچہ اُردو ادبیات میں اسکی بے شمار مثالیں مل جاتی ہیں کہ تلفظ اور لفظی صحت کے لئے دارالسلطنت کی زبان کی طرف لوگ رجوع کرتے تھے۔ یہ کبھی برج اور کبھی گوالیاری کے نام سے سامنے آتی ہے۔ اس کی قدیم ترین مثال "گوالیر کے چاتراں" کی زبان ہے جس کے دوہے اور کہاوتیں مُلّا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) میں مل جاتے ہیں۔ دکن کے مصنفین بھی اس کے دائرہ اثر سے باہر نہیں تھے۔

---

[1] برج بھاشا دیاکرن: دھیریندر ورما: صفحہ ۱۲۲

اگر شیرانی کی تحقیقات کے مطابق خالق باری (۱۶۲۱ء) کو عہد جہانگیر کے ایک بزرگ ضیاء الدین خسرو کی تصنیف مان لیا جائے تو وہی سے قبل برج کے بارے میں یہ عبارت ملتی ہے۔

"خیر خواہِ شعرائے شیریں گو ضیاء الدین خسرو باستدعائے عزیز الفواد بابا الحق قناد چند الفاظ عربی و پارسی را بزبان ہندی گوالیاری کہ ارباب روزمرہ را ناگزیر است ترجمہ نمودہ در بحور مختلفہ بطریق ریختہ بہ نظم آوردہ......"

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ عہد جہانگیری میں "ہندی گوالیاری" ارباب روزمرہ کے لیے ناگزیر تھی۔

یہ گوالیاری ہندی اکبر، جہانگیر، شاہجہاں اور عالمگیر کے عہد تک مستند زبان سمجھی جاتی تھی۔ شاہجہاں کا دہلی کو دوبارہ پایہ تخت بنانے سے کھڑی بولی یا زبان دہلوی کی حیاتِ ثانیہ شروع ہوتی ہے۔ زبان دہلوی کے نشاۃ الثانیہ میں تقریباً نصف صدی لگ گئی۔ اور محمد شاہ کے عہد میں برج پر اسکا محاورہ اور تلفظ غالب آ گیا۔ شاہجہاں کے عہد کے ایک مصنف موسیقی ابن سید علی مرزا بیگ اپنے رسالے "زمزمہ وحدت" میں "بزبان فصیح و بلیغ گوالیار" کا ذکر کرتے ہیں ع

در کام خلق وصف و بیان از لب تو ہست

شیریں و خوش بیان چو زبان گوالیار

عالمگیر کے زمانے میں "زبان گوالیاری" سے "بھوانی المتخلص بہ دلی بہ امداد بھوانی داس "گوالیاری سے فارسی میں ایک کتاب (گلزار حال) ترجمہ کرتے ہیں۔ اس سے قبل مرزا خاں کی تحفۃ الہند (۱۶۷۵ء) کا ذکر ہو چکا ہے۔

جو شاہزادوں کے تعلیم کے سلسلے میں برج بھاشا کی پہلی قواعد فارسی میں لکھی گئی ہے۔

خان آرزو "نوادر الالفاظ" میں زبان گوالیار (یا برج) کو "افصح زبانہائے ہند" اکثر جگہ لکھتے ہیں۔

چنانچہ اسی خیال پر محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں یہ فقرہ لکھا ہوگا "اتنی بات تو ہر شخص جانتا ہے کہ اُردو برج بھاشا سے نکلی ہے۔"

ہمارا خیال ہے کہ خسرو کی "زبان دہلوی" کے ارتقا کا شمالی ہند میں یک لخت رک جانے کا سب سے بڑا سبب یہی تھا کہ پایہ تخت دہلی سے منتقل ہو کر آگرہ چلا گیا تھا۔ اورنگ زیب کے زمانے سے (بالخصوص جب وہ اپنی فتوحات دکن کے سلسلے میں اورنگ آبادی اُردو سے دوچار ہوتا ہے) زبان دہلوی کا باقاعدہ ارتقا پھر شروع ہوتا ہے اور رفتہ رفتہ وہ ادبیات کے گولں کی سمجھی جانے لگتی ہے۔ اس وقت فارسی اور برج دونوں کا افسوں ٹوٹ چکا تھا۔ اور دہلوی زبان پر پنجابی کے اثرات زائل ہو کر اس کی اپنی مستقل شکل متعین ہو چکی تھی۔ گو اُردو کے پہلے بڑے ماہر لسانیات خان آرزو "زبان اُردو" یا "زبان اُردو شاہی" کے مقابلے میں سند "گوالیاری" سے لینا پسند کرتے تھے۔ لیکن خان آرزو آخری شاعر اور عالم تھے جنہوں نے گوالیاری کو مستند جانا ہے۔ محمد شاہ کے دور سے دہلوی سماج کے اعلیٰ طبقات کا محاورہ افصح اور بلیغ سمجھا جانے لگا۔ خان آرزو کی گوالیاری" پسندی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ ان کے پیشِ نظر عبدالواسع کی غرائب اللغات ہندی تھی۔ عبدالواسع کا وطن علاقہ ہریانہ میں "ہانسی" تھا اور چونکہ ان کے پیشِ نظر عوامی محاورہ تھا اس لئے انہوں نے ثقات کے نقطۂ نظر سے غلط لکھا ہے۔ ایک دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ خان آرزو کا

آگرہ اور گوالیار سے گہرا تعلق رہا تھا اور ظاہر ہے کہ مادری زبان کی حیثیت سے
انہوں نے برج ہی کا محاورہ سیکھا ہوگا۔ لیکن چونکہ خان آرزو نے اپنی نوادر الالفاظ
دہلی میں بیٹھ کر لکھی اس لئے "الفاظ کی بہت سی مکتوبی اور ملفوظی صورتیں وہی ہیں جو
غرائب اللغات میں موجود ہیں۔ اگرچہ خان آرزو ہانسوی کے بہت سے الفاظ کو ٹکسال
باہر قرار دیتے ہیں مگر بہت سے ایسے الفاظ کو قبول بھی کر لیتے ہیں، جنھیں بعد کے
مصلحین زبان اُردو نے مکروہ اور گنواری قرار دے کر زبان سے خارج کر دیا[۱]"

---

[۱] مقدمہ "نوادر الالفاظ" (خان آرزو)، مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ۱۹۵۱ء

پنجابی اور دکنی

پروفیسر شیرانی کے لسانی نظریہ کی تنقید

پروفیسر شیرانی نے اپنی تصنیف "پنجاب میں اردو" میں بعض تاریخی مفروضات کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ کھڑی اور ہریانی پنجابی مسلمانوں کے داخلۂ دہلی کے بعد ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ اس کا تاریخی جائزہ پچھلے صفحات میں لیا جاچکا ہے۔ پروفیسر مرحوم کے نظریہ کا دوسرا پہلو خالص لسانیاتی ہے۔ اردو، دکنی اور پنجابی صرف و نحو کی مشترک خصوصیات کا ذکر کر کے انہوں نے بعض اہم لسانی نتائج اخذ کئے ہیں۔ لسانی استدلال کے اسی طریق پر ذیل میں تنقید کی جائے گی۔

پروفیسر شیرانی نے "پنجاب میں اردو" لکھتے وقت اس لسانی حقیقت کو بالکل نظرانداز کر دیا ہے کہ راجستھانی اور گجراتی کی طرح پنجابی کا تعلق بھی کسی زمانے میں زبانوں کی بیرونی شاخ سے تھا جس کے اثرات کی نشاندہی آج بھی کی جاسکتی ہے۔ بعد کو (شاید شورسینی اپ بھرنش کے عہدِ عروج میں) اس پر اندرونی زبان (مدھ دیش کی زبان جس کی نمائندہ بولیاں

برج اور کھڑی ہیں) کا اس قدر گہرا اثر پڑا کہ اس کی صورت بدل گئی۔ اس کا ثبوت اس بات سے ملتا ہے کہ مغربی اور مشرقی پنجابی کے درمیان خط فاصل قائم کرنا دشوار ہے۔ یہ دونوں زبانیں اس غیر محسوس طریقے پر گھل مل جاتی ہیں کہ گریرسن کے خیال میں کسی زمانے میں سارے پنجاب پر لہندا چھائی ہوئی تھی، جسے بعد کو دوآبہ کی بولیوں نے پیچھے ڈھکیلنا شروع کیا۔ اور رچنا دوآب تک ہٹا دیا۔ دوآبہ کی زبان کے نشانات سندھ ساگر دوآب تک کی لہندا میں پائے جاتے ہیں[1]۔ جوں جوں مشرق کی سمت آیئے اس کا رنگ اور گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اسی لئے راجستھانی اور گجراتی طرح پنجابی کو "ملواں" زبانوں کی صف میں جگہ دی گئی ہے۔

ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کی پیدائش کے سلسلے میں ہر قسم کا مطالعہ اور تنقید بے سود ثابت ہوگی جب تک کہ:-

(الف) ہند آریائی زبان کے ارتقا کی عہد قدیم سے نشان دہی نہ کی جائے بالخصوص جب تک کہ عہد اپ بھرنش کی ادبیات کا لسانی جائزہ نہ لیا جائے۔

(ب) جب تک کہ تقابلی مطالعہ تمام ہمسایہ بولیوں کے ساتھ نہ کیا جائے۔

شیرانی نے اپنی تصنیف میں نمبر (الف) کو نظر انداز کر کے اپنے لسانی نظریہ کو بے بنیاد کر دیا ہے۔ اور نمبر (ب) کا خیال نہ رکھنے کی وجہ سے وہ بعض یک طرفہ لسانی نتائج مرتب کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ہر دو ہمسایہ بولیوں میں کچھ نہ کچھ مشترک خصوصیات ضرور ہوتی ہیں۔ چنانچہ اُردو اگر ایک طرف اپنی قواعد کے اعتبار سے پنجابی سے ملتی جلتی ہے تو دوسری طرف ہریانی سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ آجکل کی معیاری اُردو مراد آباد اور بجنور کے

---

[1] لسانیاتی تبصرہ ہند: جلد نہم حصہ اوّل: صفحہ ۱۶۴

اضلاع کی بولی سے قریب تر ہے۔ لیکن اپنے ارتقا کے ابتدائی مدارج میں یہ جمنا پار کی ہریانی بولی سے زیادہ قریب تھی۔ قدیم دکنی میں بعض اثرات پنجابی کے بھی جھلکتے ہیں۔ اس لیے تقابلی مطالعہ کا میدان ذرا وسیع ہونا چاہیے۔ اور جہاں تک ہوسکے پنجابی، اردو، ہریانی اور برج بھاشا کی ادبیات کے قدیم ترین نمونوں پر نظر رکھنی چاہیے۔

(۱) شیرانی نے پنجابی اور اردو کی ایک اہم مشترک خصوصیت علامت مصدر "نا" بتائی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ "نا" کی علامت مصدر پنجابی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ قدیم زمانے (دیکھیے نمونہ محبوب عالم پنجاب میں اردو) سے ہریانی میں "ن" کے ساتھ ساتھ "نا" بھی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خود پنجابی میں "نا" کے ساتھ ساتھ "ن" بھی بطور علامت مصدر ملتا ہے۔ مثلاً گھالنا اور گھالن، دیکھنا[1]۔ جہاں تک اختتام پر نون غنہ (ناں) کا تعلق ہے یہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں۔ دہلی کے آس پاس کی بولیوں میں قدیم زمانے سے یہ خصوصیت ملتی ہے۔ دہلی والے آج بھی دہی کو دہیں (خالق باری: دہیں، سب رس = دہیں)۔ باراں، ستراں۔ وغیرہ بولتے ہیں۔ نون غنہ کا سلسلہ اپ بھرنش سے ملایا جاسکتا ہے جس میں حروف علت عام طور سے انفی ہو جاتے ہیں۔ دکنی چونکہ اکثر اپ بھرنش خصوصیات کی حامل ہے اس لیے اس میں اس کی بے شمار مثالیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً کونچے۔ کونچے $\frac{48}{9}$ س۔ ر، سنتانا (ف۔ ق۔ م) آدمیں (آدمی) (ف۔ ق۔ م) برسانت (ف۔ ق۔ م) دیکھلائینگا (س۔ ر۔ صفحہ ۱۹) جائینگا (س۔ ر۔ صفحہ ۱۹) ان کے علاوہ سیں، کوں، توں وغیرہ تو ہر صفحہ پر مل جائیں گے۔ غنہ آواز کی پیدائش جدید آریائی زبانوں کی مشترک عالم گیر

---

[1] گریرسن: لسانیاتی تبصرۂ ہند: پنجابی گرامر کا خاکہ: جلد نہم حصہ اول: صفحہ ۶۳۰

خصوصیت ہے۔ توں (تو) پنجابی سے لے کر دکنی، ہریانی، کھڑی بولی، راجستھانی اور برج بھاشا تک میں یکساں طور پر قدیم زمانے سے مستعمل ہے۔ "خیر المجالس" اور "مکتوبات قدوسیہ" کے ہندی فقروں میں بیک وقت (تو)، اور (توں) ملتا ہے۔

(۲) اُردو (ا) گروہ سے تعلق رکھنے والی زبان ہے یعنی اس میں اعلام و اسمار اور اسمائے صفات الف پر ختم ہوتے ہیں جب کہ برج بھاشا بندیلی اور قنوجی میں "او" پر۔ اس سلسلے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُردو پنجابی سے متاثر ہے جس کی مخصوص خصوصیت (ا) ہے۔ یہاں یہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ (ا) اور (او) دونوں شکلیں ازمنۂ وسطیٰ کی پراکرتوں سے ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ مغربی ہندی کی تین بولیوں نے (او) کی شکل کو اپنایا لیکن باقی ماندہ دو بولیوں (کھڑی اور ہریانی) میں (ا) ہی کی شکل ملتی ہے۔ یہ امراب مسلمہ ہے کہ قدیم دکنی شمالی ہند کی کسی ایسی بولی پر مبنی ہے جس کی بنیاد (ا) پر ہے یعنی اس میں اسمار، اسمائے صفات اور اعلام کا اختتام 'الف' پر ہوتا ہے۔ چنانچہ دکنی ادبیات میں (او) کی شکل کہیں نہیں ملتی۔ اس کی مزید توضیح اُردو کے ایک دیہاتی نام یعنی کھڑی بولی سے ہو جاتی ہے۔

لفظ "کھڑی" بولی کے متعلق اب تک عجیب و غریب قیاس آرائیاں ہوتی آئی ہیں۔

(۱) پنڈت چندر دھر شرما گلیری کا خیال تھا کہ "بدیسی مسلمانوں نے آگرہ، دلی، سہارن پور اور میرٹھ کی کسی "پڑی بھاشا" کو "کھڑی" بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے قابل بنا دیا"[1]

(۲) کھڑی بولی کی تشریح میں اسی قسم کی غلط فہمی ڈاکٹر عبدالحق کو ہوئی ہے۔ وہ

---

[1] ناگری پرچارنی پترکا سمبت ۱۹۷۸: صفحہ ۲۴۲-۲۴۴

لکھتے ہیں "کھڑی بولی کے معنی ہندوستان میں عام طور پر گنواری بولی کے ہیں جسے ہندوستان کا بچہ بچہ جانتا ہے۔ وہ نہ کوئی خاص زبان ہے اور نہ زبان کی کوئی شاخ۔"[1]

(دراصل کھڑی بولی کے تصور کے لئے برج بھاشا کا پس منظر ضروری ہے۔ ایک کا تعلق (ا) گروہ کی زبانوں سے ہے اور دوسری کا (اُ) گروہ والیوں سے۔ اگر یہ کہا جائے کہ برج بھاشا کے مقابلہ میں یہ بولی کھڑی لگتی ہے۔ تو بات ذرا عقلیات کے دائرہ سے نکل کر حسیات میں آجاتی ہے۔ لیکن اس کا عقلی اور لسانی جواز ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بندیل کھنڈ میں اِسے 'ٹھاڑ بولی' اور مارواڑ میں 'ٹھاٹھ' بولی کہتے ہیں "ٹھاڑ" اور "ٹھاٹھ" دونوں کا مفہوم "کھڑا" ہوتا ہے۔ زبان کا یہی کھڑا لب و لہجہ پوربی اور برج بھاشا کے مقابلہ میں معیاری سمجھا جاتا ہے۔

یہی کھڑا لہجہ ہریانے کے علاقے اور جاٹوں کی زبان میں 'اکھڑ' بن جاتا ہے۔ جو درمیانی حروف علت بلا استثنا، دبا دیتے ہیں۔ گڈّی، بدّل، لتّا، رُتّی وغیرہ۔ قدیم دکنی میں یہ بھی رجحان پایا جاتا ہے۔

اسماء و صفات کے سلسلہ میں ذیل کی مشترک خصوصیات پر پروفیسر شیرانی نے زور دیا ہے۔

(۲) اسما۔ صفات تذکیر و تانیث اور جمع و واحد میں اپنے موصوف کی حالت کے مطابق ہوتے ہیں۔

اُردو:	بڑا لڑکا	بڑے لڑکے	چھوٹی لڑکی	چھوٹی لڑکیاں
پنجابی:	وڈّا منڈا	وڈّے منڈے	نکی کڑی	نکیاں کڑیاں

---

[1] رسالہ اُردو: جولائی ۱۹۳۳ء: صفحہ ۵۹

میر و سودا سے پہلے کی اُردو اور دکنی میں چھوٹی لڑکیاں کی بجائے "چھوٹیاں لڑکیاں" ہی کہا جاتا تھا شیرانی کے خیال میں "یہ بے ضابطگی میر و سودا کے عہد سے شروع ہوتی ہے"۔

(۴) خبر تذکیر و تانیث، واحد جمع میں اپنے مبتدا کے موافق آتی ہے۔

جدید اُردو : یہ بات بھلی نہیں   یہ باتیں بھلی نہیں

پنجابی : ایہ گل چنگی نہیں   ایہ گلاں چنگیاں نہیں

قدیم اُردو دکنی میں : .... یو باتاں بھلیاں نہیں ہوتا

سودا ؎ نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

(۵) فعل تذکیر و تانیث و واحد جمع میں اپنے فاعل کے مطابق آتا ہے۔

اُردو : عورت آئی   عورتیں آئیں

پنجابی : بڈھی آئی   بڈھیاں آئیں

قدیم اُردو اور دکنی : .....   عورتاں آئیاں

حاتم ؎ جب سے تری ادائیں عالم کو بھائیاں ہیں (۱۱۵۶ھ)

تب سے جہاں میں تونے دھومیں مچائیاں ہیں

سودا ؏ یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کا ہار ہو پڑیاں

(۶) اضافت بھی اپنے فاعل کی تذکیر و تانیث اور واحد و جمع کے مطابق آتی ہے۔

اُردو : اس میں کوٹھریاں رنگ برنگی ہیں۔ بعض چاندی کی ...... وغیرہ

پنجابی : اوہ دے وچ کوٹھریاں رنگ برنگیاں ہیں۔ بعضیاں چاندی دیاں .... وغیرہ۔

دکنی : اس میں کوٹھریاں تنگ برنگ کیاں بعض چانا ری کیاں ...... وغیرہ

(ہزار مسائل)

دکنی : یوں نو و ہزار باتاں اللہ ہور محمدؐ کیاں .... (معراج العاشقین)

مذکورہ بالا لسانی خصوصیات کے متعلق یہ کہنا کہ اردوئے قدیم یا دکنی نے پنجابی سے لی ہونگی محض بے بنیاد قیاس آرائی ہوگی. یہی صرفی خصوصیات دہلی کے قرب وجوار کی بولیوں میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ انبالہ کی کھڑی بولی اور ہریانہ علاقہ کے قدیم ترین مصنفوں محمد افضل اور عبدی، شیخ محبوب عالم ساکن جھجر وغیرہ کے یہاں ملتی ہیں. مثلاً دن کی جمع دناں، کھیت کی جمع کھیتیاں، گھر کی جمع گھراں وغیرہ آج بھی ہریانہ کے علاقہ میں بولی جاتی ہیں۔[1] شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں اسی نہج پر ٹکران۔ غریباں جھوٹاں۔ اونٹاں ملتی ہیں۔[2] ~

لب پر کلی کی مہر کرے اُس لباں کا رنگ (حاتم)

اسی طرح سے آئیاں، جائیاں وغیرہ حاتم، میر اور سودا سے لے کر لکھنؤ میں میر انیس اور دہلی میں داغ تک نے باندھا ہے۔ راقم السطور نے خود دہلی کی بڑھیوں کی زبان سے اس قسم کے صیغے سُنے ہیں. شاہی زمانہ تک لال قلعہ کی یہی زبان تھی۔ اس کی لسانی وجہ ہمارے خیال میں یہ ہے کہ اس وقت تک جدید آریائی زبانوں میں "نے" نے علامت فاعلی کی شکل میں جڑ نہیں پکڑی تھی. یہی وجہ ہے کہ اُردوئے قدیم میں "نے" کا جتنی بے ضابطگی کے ساتھ استعمال ملتا ہے۔ اس کی نظیر نہیں ملتی. قدیم ہندی یا اُردو ادب میں

---

[1] گریرسن : لسانیاتی تبصرۂ ہند جلد نہم حصہ اوّل صفحہ ۲۵۷ : اور گرامین ہندی صفحہ ۳۶ دھیر ینیدر ورما۔

[2] اورینٹل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۱ء : ہریانی میں تالیفات : شیرانی

"نے" علامت فاعلی کے طور پر کہیں استعمال نہیں ہوا ہے۔ البتہ پنجابی اور گجراتی میں علامت مفعولی کے طور پر قدیم زمانہ سے مستعمل ہے جدید گجراتی میں اُردو کی طرح علامت فاعلی کے طور پر بھی استعمال ہونے لگا ہے۔ افعال کا مفعول کی بجائے فاعل کے مطابق آنے کی یہی وجہ ہے۔ دکنی میں دونوں صورتوں میں یہ بکثرت ملتا ہے۔ لیکن دکنی میں "نے" کے استعمال میں بے قاعدگی ملتی ہے۔ اس میں یہ فاعل اور مفعول دونوں کے لئے آتا ہے۔ جیسا کہ ہریانی کا دستور ہے۔ لیکن فاعلی علامت ہونے کی حالت میں اُردو کے برخلاف فعل اپنے فاعل کا تابع رہتا ہے۔

(۱) فاعلی : (۱) غمزے نے نظر کو اپنے گھر لے کر گیا (سب رس صفحہ ۹۰)

(۲) رقیب نے روسیاہ نے بے نصیب نے بولیا (〃 صفحہ ۱۷۱)

(۲) مفعولی : (۱) آدمی برا اچھے تو شراب نے کیا کرنا (〃 صفحہ ۲۳۱)

(۲) بے نمک کھانے تے آدمی نے کیا سواد پانا (〃 صفحہ ۲۸)

میر و سودا کے زمانہ تک اس کے استعمال میں قاعدہ کی پابندی نہیں برتی جاتی تھی۔ ع گل کو محبوب میں قیاس کیا (میر)

حاتم نے بعض اوقات "نے" فاعلی استعمال کی ہے لیکن ان کا عام رجحان یہی ہے کہ وہ اسے حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً ان کی وہ غزل جس کی ردیف 'ہم' ہے (کئے ہیں ہم۔ پئے ہیں ہم) میں 'نے' فاعلی نہیں ملتی۔ مزید مثالیں "میں دیکھا" (انتخاب حاتم صفحہ ۲)، "ہم میر کر جو دیکھا" (ایضاً صفحہ ۱۴)۔ ع "رات ہم خواب میں اُس زلف کو پیچاں دیکھا" (ایضاً صفحہ ۲) لیکن 'نے' فاعلی کی مثالیں مل جاتی ہیں۔ ع "کہ جیسا ہم نے کھینچا آن کر آزار دنیا میں" (ایضاً صفحہ ۷۹) مزید صفحہ ۲۹ اور صفحہ ۳۵ پر۔

آج بھی ہریانی میں بحیثیت علامتِ فاعل اور مفعول ایک ہی جملہ میں اس طرح استعمال ہوتا ہے۔

من نے صاحب نے مار یا۔ مجھے صاحب نے مارا

حروف عطف میں "ہور" جو دکنی سے بھی مخصوص ہے پنجابی کی نمایاں خصوصیت نہیں۔ بلکہ مغربی ہندی کی اکثر بولیوں اور راجستھانی میں مشترک ہے۔ مغربی روہیلکھنڈ اور شمالی دوآبہ میں یہ "اُور" "آر" یا "ہر" ہو جاتا ہے بلکہ دہرہ دون اور سہارنپور کے اضلاع میں یہ صاف "ہور" سنائی دیتا ہے۔

افعال :-

(۷) فعل امر کے متعلق شیرانی لکھتے ہیں "امر کا قاعدہ اردو پنجابی میں بالکل ایک ہے" یعنی علامتِ مصدر گرادی جائے تو امر باقی رہ جاتا ہے۔ مثلاً چلنا (چل)۔ کرنا (کر)، پروفیسر مرحوم کا یہ بیان بالکل صحیح ہے لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ دعویٰ بھی بالکل صحیح ہوگا کہ امر کا قاعدہ اردو اور بنگالی، اردو اور گجراتی، اردو اور مرہٹی میں بالکل ایک ہے۔ دراصل امر کا یہ قاعدہ پنجابی یا اُردو کے ساتھ مخصوص نہیں۔ ہندوستان کی تمام جدید آریائی زبانوں میں 'امر' اسی طرح بنتا ہے۔ چل، کر، وغیرہ آج پنجاب سے لے کر بنگال اور دکن تک بعینہٖ مستعمل ہیں۔ اس قسم کے یک طرفہ بیانات عام طور سے اپنے دعویٰ کی حجت کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔

(۸) لفظ "تھا" کے متعلق پروفیسر موصوف نے ایک نئے نظریہ کا استخراج کیا ہے۔ اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ملتانی زبان کے مصدر تھیونا (بمعنی ہونا) سے نکلا ہے لکھتے ہیں۔

" تھا ۔ اس غریب کو لغات نگاروں نے مصدر 'ہونا' کا پسر خوانده بنا دیا ہے ۔ ان کا بیان ہے ۔ کہ یہ 'ہونا' کی ماضی ہے ...... سنسکرت اور پراکرت کی آڑ میں خدا جانے ہم سے کیا کیا قبلوایا جا رہا ہے ۔ لیکن ایک موٹی سی بات یہ ہے کہ کیا یہ ضروری ہے کہ لفظ سنسکرت کے ماخذ سے نکالا جائے ۔ اب میں بجائے اس کے کہ " تھا " کو " ہونا " کے گلے باندھوں اور پھر " ہونا " کو سنسکرت کے " بھو " سے استخراج کروں ۔ یہ زیادہ موزوں سمجھتا ہوں کہ اُس کو ملتانی زبان کے مصدر تھیونا (بمعنی ہونا) کی ماضی مان لوں ۔ " تھیونا " کی ماضی " تھیا " آتی ہے ۔ اُردو والوں نے اُسے یائے اشمام سمجھ کر اُڑا دیا اور " تھا " بنا لیا " تھیا " اس قدر قدیم ہے کہ ہندی کا سب سے قدیم جملہ جو ہمیں تاریخ میں ملتا ہے ۔ اس میں یہ موجود ہے :"

" برکت شیخ تھیا " اک موا اک نہا " (تاریخ فیروز شاہی ؛ عفیف ص۳۲۱)

اُردو کے استخراج کے متعلق پروفیسر موصوف کا تاریخی اور لسانی استدلال تقریباً ہر جگہ اسی قسم کا ہے ۔ ہندی اُردو کے فعل امدادی (ماضی) " تھا " کا تعلق سنسکرت کے " بھو " سے نہیں " ستھ " ([illegible]) سے ہے ۔

اُردو : تھا ے پراکرت تھائی ۔ ٹھائی ے سنسکرت اتھت (स्यत) یہ ہے ۔ 'تھا' کی لسانی تاریخ ۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ 'تھیونا' اور 'تھیا' ملتانی میں مصدر اور فعل ماضی کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۔ لیکن 'تھیا' پنجابی اور ملتانی میں فعل امدادی ماضی کے طور پر مستعمل نہیں ۔ پنجابی کی ماضی میں فعل امدادی ۔ ساں ۔ سی اور سوں آتے ہیں[1] ۔ جہاں تک " برکت شیخ تھیا ... " والے جملے کا تعلق ہے ۔ ہمیں اس میں بھی اختلاف ہے ۔

---

[1] پنجابی گرامر ؛ بیلی ص۲۲۳ (کلکتہ)

یہ "شیخ تھیا" نہیں ہے بلکہ "برکت شیخ تھپا (یا تھبا)۔۔۔۔" ہے شیخ تھپا سندھ میں اس عہد کے ایک بڑے بزرگ گذرے ہیں۔

(۹) پنجابی میں گا۔گی۔گے کے علاوہ مستقبل "سی" کی تصریف سے بھی بنتا ہے۔ جس کا تعلق لہندا زبان سے ہے۔ دکنی میں اس قسم کے مستقبل کی مثالیں مل جاتی ہیں۔

(۱) واحد غائب: اس کتاب بغیر کوئی اپنا وقت بھلا سی نا (سب رس ص۱)

(۲) جمع غائب: انو کے دلاں پر ایسے خطرے ہر گز نا آسیں (سب رس ص۱۰۵)

(۳) واحد حاضر: جو لگن تو سب تے بے طمع نہ ہوسی (" ص۲۲)

(۴) واحد متکلّم: میں ایسی نیں ہوں، تو بولے پچھیں تدبیر کرناسوں (" ص۲۱۵)

لیکن یہ بڑی دلچسپ بات ہے کہ باقی صیغے یعنی جمع حاضر اور جمع متکلّم سب رس میں نہیں ملتے۔ سب رس میں "سی" اس قدر کمی کے ساتھ ملتا ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں یہ متروک ہو رہا تھا۔ لیکن اس "سی" کا تعلق محض لہندا سے نہیں۔ مغربی حلقہ کی جتنی بھی بیرونی زبانیں ہیں ان کی یہ علامت مخصوص ہے راجستھانی کی اکثر بولیوں میں "گا" کے ساتھ ساتھ "سی" کا بھی استعمال ہوتا ہے۔ میواتیوں کا دہلی کے بازاروں میں قدیم زمانے سے زور رہا ہے میواتی راجستھانی ہی کی ایک بولی ہے۔

(۱۰) غیر زبان کے الفاظ کے آخر میں یائے زائدہ کا اضافہ بھی پنجابی کی تنہا خصوصیت نہیں۔ برج بھاشا، قنوجی اور اودھی بولیوں میں یہ عام طور سے پائی جاتی ہے۔ کان پور کی بولی میں 'بعد' کو 'بعدی' کہا جاتا ہے۔

(۱۱) مانگا تانگا۔ چپ چپاتے۔ ہلنا جلنا وغیرہ الفاظ کو شیرانی نے پنجابی صرف اس لئے بتایا ہے کہ اس میں دوسرا لفظ جسے اُردو لغت نگاروں نے غلطی سے مہمل کہا ہے۔

پنجابی میں ایک مستقل لفظ کی حیثیت رکھتا ہے اس قسم کے دوہرے اسماء مثلاً گھوڑا دوڑا ' لوٹا اوٹا ' میں تو عام طور سے دوسرا لفظ بے معنی ہی ہوتا ہے لیکن افعال میں عام طور سے ہم معنی لفظ یکجا کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ خصوصیت ہندوستان کی تمام نئی آریائی زبانوں میں ملتی ہے جس کا تعلق براہ راست پراکرت سے ملایا جاتا ہے۔

(۱۲) حالتِ مجرّدری میں " دن " کا اضافہ بھی پنجابی سے مخصوص نہیں اُردو میں آنکھوں دیکھا ' بمعنی آنکھوں سے دیکھا ' اب بھی مستعمل ہے۔

(۱۳) مغربی ہندی (اور اس کی بولیوں ' کھڑی ' برج ' ہریانی وغیرہ)۔ کی ایک عام خصوصیت یہ ہے کہ اس میں (د) ہمیشہ (ب) میں تبدیل ہو جاتا ہے مثلاً۔

سنسکرت : وِچار = بِچار (برج۔ دکنی۔ ہریانی۔ کھڑی)

س : وِش = بِس (برج ' کھڑی ' ہریانی وغیرہ)

س : وِین = بِین (" " " ")

اسی طرح بیچ ' بات ' بِرن ' بید وغیرہ مغربی ہندی کے علاقے میں عام طور سے بولے جاتے ہیں۔ قدیم دکنی ادبیات سے حسبِ ذیل الفاظ اس رجحان کی تائید کرتے ہیں۔

جوبن (س : یوّن : ق - ق $\frac{۳}{۲۴}$ ' برن (س : ورن : ف - ش - پ)
بچن (س : وچن - ف - ش - پ) بات (س : وارتا - ف - ش - پ) بست (س : وستو (چیز) - ف - ش - پ) - بس (س : وِش - ف - ق - م) - بجز (س : وَجر (پتھر) - ف - ق - م) وغیرہ۔

مغربی ہندی کے اس اٹل صوتی اصول کے سامنے خود عربی فارسی کے الفاظ

نہ ٹک سکے ۔ چنانچہ دو آبہ کے دیہاتوں میں وکیل کا بکیل ولایت کا بلایت وغیرہ اکثر سننے میں آتا ہے ۔ اس کے برخلاف پنجابی میں بیشتر (د) کو برقرار رکھا جاتا ہے ۔ مثلاً وِچ (بیچ)۔ وال (بال)، وڈائی (بڑائی)۔ ویر (بیر)۔ وچار (بچار)۔ وگاڑ (بگاڑ)۔ وِش (بس)، ورف (برف) وغیرہ وغیرہ۔

قدیم پنجابی (گرو گرنتھ صاحب[1]) سے اس دعویٰ کی تائید :۔

(وچ صفحہ ۲ سطر ۱۳)۔ (وڈیائی صفحہ ۳۹۵)۔ (وچارنا صفحہ ۱۴ بار بار آیا ہے)۔ (وسارنا (بسرنا) صفحہ ۲۵)۔

پنجابی کی طرح سندھی لہندا اور گجراتی میں بھی یہ خصوصیت پائی جاتی ہے۔

گجراتی	اردو	گجراتی	اردو
وینا	بین	وچار	بچار
پروت	پربت	وِش	بس

پروفیسر شیرانی مذکورہ بالا صوتی اصول کی تعبیر اِن الفاظ میں کرتے ہیں "پنجابی اور اردو میں بعض حروف آپس میں تبدیل ہو جایا کرتے ہیں۔ مثلاً پنجابی کی (د) اُردو میں (ب) سے تبدیل ہو جاتی ہے"۔ لیکن اگر پروفیسر موصوف کی نظر آریائی السنۂ ہند کے تبدیلیٔ حروف کے اصولوں پر ہوتی تو وہ شاید اُردو پنجابی کا رشتہ اس طور پر قائم نہ کرتے ۔

(۱۴) پنجابی زبان کی ایک دوسری عام خصوصیت شیرانی یہ بتاتے ہیں کہ :
"تمام ایسے الفاظ جن میں ثانی حرف علّت ہو بہ تخفیف حرفِ علت تلفظ کیا جاتا ہے۔

---

[1] اُردو ایڈیشن : نول کشور پریس ۱۹۰۶ء

مثلاً کان ۔ناک ۔ بات اور لات پنجابی لہجہ میں کن ۔نک ۔ بت اور لت بن جاتے ہیں'
یا یوں کہنا چاہیے کہ ایسے الفاظ میں برج بھاشا میں پہلے حرف کے بعد حرف علت
اضافہ کر دیا جاتا ہے ۔ مثلاً پنجابی پگ بھاشا میں جا کر پاگ بن گئی ۔ اُردو میں جو
پنجابی اور برج کے بین بین ہے اس قاعدہ کا اثر بہت نمایاں ہے اور دونوں
زبانوں کی مقلّد ہے ۔ کبھی برج کی تقلید کرتی ہے کبھی پنجابی کی اور کبھی دونوں کی ۔
مثلاً اُردو میں (جگنا) بھی بولتے ہیں ۔ اور (جاگنا) بھی ۔ لیکن اکثر موقعوں پر دیکھا
جاتا ہے کہ اُردو کا میلان زیادہ تر پنجابی قاعدہ کی طرف ہے ۔"

پروفیسر شیرانی کے اس خیال کے متعلق ہمیں پھر کہنا پڑتا ہے کہ وہ جدید زبانوں
کے مسائل پر بحث کرتے وقت پراکرت اور اپ بھرنش کے لسانی اصولوں کو بالکل نظر
انداز کر جاتے ہیں ۔ آخری دور کی پراکرتوں کی یہ ایک نمایاں خصوصیت تھی کہ ان میں ایسے
الفاظ بکثرت ملتے تھے جن میں ایک حرف علت سے پہلے مشدّد حرف صحیح ہوتا تھا مثلاً (کھگو
(کھڑگ ۔تلوار) ۔ مکھنم (مکھن) وغیرہ ۔ چنانچہ اس قسم کے الفاظ سہل اس طرح بنائے جاتے
تھے کہ مشدّد حرف کو سادہ تلفظ کرتے تھے' اور اس سے پہلے آنے والے حرف علت کو
کھینچ کر ادا کرتے تھے ۔ سہل بنانے کا یہ اصول شورسینی پراکرت میں کم رائج تھا ۔ یہی وجہ ہے
کہ اپ بھرنش عہد کا ادب اتنا ثقیل اور کرخت معلوم ہوتا ہے ۔ برج بھاشا میں البتہ
مشدّد الفاظ کو آسان بنا لیا جاتا ہے ۔ مثلاً اُردو کا مکھن برج بھاشا میں ماکھن ہو جاتا ہے ۔

ع میّا میں نہیں کھائیو ماکھن روٹی (سورداس)

جوں جوں ہم راجستھانی' مرہٹی اور گجراتی زبانوں کے علاقے کی طرف آئیں یہ رجحان
بڑھتا چلا جاتا ہے ۔ حتیٰ کہ گجراتی اور مرہٹی کا یہ عام اصول بن جاتا ہے ۔ ان دونوں میں

مکھن ہمیشہ ماکھن کہا جائے گا۔ مزید مثالیں۔

اُردو	مرہٹی	اُردو	گجراتی
منش	مانوس	مکھن	ماکھن

لیکن جدید اُردو کا لہجہ کافی بدل گیا ہے۔ اور اکثر الفاظ میں وہ برج کی مقلد بن گئی ہے۔

اُردو	برج بھاشا	پنجابی
مانگنا	مانگنا	منگنا
مونگ	مونگ	منگ
بادل	بادل	بدّل
بیچ	بیچ	وِچ
چاول	چاول	چول
اونچا	اونچا	اُچّا
لاکھ	لاکھ	لکھ

دکنی میں عام طور سے الفاظ کا تلفظ بہ تخفیف حرفِ علت ہوتا ہے۔ مثلاً سجن، سرج (سورج)۔ اگے (آگے)، ٹٹنا (ٹوٹنا)۔ ڈُب (ڈوب)، چندہ (چاند)۔ بند (بوند)۔

لہ حروفِ علت کو دبا دینے یا گرا دینے کا رجحان جدید ہند آریائی زبانوں ہی میں پایا جاتا ہے۔ قدیم زبانوں میں یہ ناممکن تھا۔ اُردو شاعری میں جو حروفِ علت کو گرا دینے کا رجحان پایا جاتا ہے وہ اِسی نئے عہد کی یادگار ہے۔ ہندی پنگل میں یہ بالکل جائز نہیں۔ لکھنوی شعراء نے لکھنوی لہجہ (جو یقیناً اودھی سے متاثر تھا) کا احترام کرتے ہوئے اس کے خلاف ہمیشہ احتجاج کیا ہے۔ اودھی اور برج بھاشا میں یہ میلان نہیں ملتا۔ بلکہ ان میں عام طور سے حروفِ علت کو کھینچ دیا جاتا ہے۔

کئی (کوئی) ، جھگی (جو کوئی) ، بدّل (بادل) ، ہتی (ہاتھی) ، گُنگے (گھونگے) ، اُپر (اوپر) ، بغر (بغیر) ، دُسرا (دوسرا) تیسرا (تیسرا) ، گدُ (گودا) ، گھنگٹ (گھونگھٹ) ، پرم (پریم) ، پرت (پریت) ، سُنگنا (سونگھنا) ، منگنا (مانگنا) ، ڈھنڈنا (ڈھونڈھنا) ، اسمان (آسمان) غیب (غائب) ۔

لیکن اکثر ایسا نہیں بھی ہوتا ہے ۔

چلی ہے کے چھپ سوں پکڑ ہت میں ہات (گلشن عشق صفحہ ۲۲۹ : نصرتی)

اسی طریقے سے : مانگ کر (ق ۔ ق صفحہ ۹۴) البتہ منگ کر زیادہ ملتا ہے)

بولانا ۔ چھوپاتی ۔ چھوپا کر (س ۔ ر صفحہ ۲۳) سودتی (ف ۔ ش ۔ پ) موٹھی (مٹھی) بُلبُول (بلبل) جاگا (س ۔ ر صفحہ ۱۹) ۔ چاند (س ۔ ر صفحہ ۳۴) رلکھے (س ۔ ر صفحہ ۲۱۲) بوند (س ۔ ر صفحہ ۲۱۴) ۔

کھڑی بولی کے اکثر اضلاع (مثلاً مشرقی انبالہ ۔ سہارن پور ۔ میرٹھ ۔ مظفر نگر) میں مشدّد الفاظ کثرت سے استعمال کئے جاتے ہیں ۔ اور ہریانی کی تو یہ عام خصوصیت ہے ۔

اس سلسلے میں یہ دلچسپ بات ہے کہ قدیم اردو اور دکنی میں مشدّد الفاظ شائستگی کی علامت سمجھے جاتے تھے ۔ لہجہ جتنا کھرا ہوتا تھا اُتنا ہی کھرا سمجھا جاتا تھا ۔ اب یہ لہجہ کسی قدر گنوارو خیال کیا جاتا ہے ۔ خان آرزو دہلوی زبان کے ارتقا کے ابتدائی مدارج ہی میں عبدالواسع ہانسوی کے ہریانوی تلفظ پر معترض تھے اور اُسے گنوارو خیال کرتے تھے ۔ چنانچہ فصاحت کے اعتبار سے 'جگنے' پر 'جاگنے' ؛ 'متھے' پر 'ماتھے' ۔ 'ہت' پر 'ہاتھ' ، 'لکھ' پر 'لاکھ' ، 'پچھے' پر 'پیچھے' کو زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے ۔ اہلِ لکھنؤ دہلی والوں کی زبان کو کسی قدر کرخت سمجھتے رہے ۔ لاہور والے آج تک یو ۔ پی والوں کی زبان کو "'بریک' (باریک) زبان" کہتے ہیں ۔ دہلوی اور روہیلکھنڈی لہجہ میں ایک طرح

صدیوں سے اُردو کے تلفظ کا معیار متعین ہو گیا ہے۔ اُن کے کھڑے اندازِ گفتگو کے مردانہ حسن کو آج بھی سراہا جاتا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس لہجہ کی تکمیل "لاہوری اُردو" میں تو نہیں ہوگی؟

تخفیف حروف علت کے لحاظ سے اُردو برج اور پنجابی کے درمیان ڈولتی ہے۔ قدیم اُردو اور دکنی میں یہ تخفیف عام طور سے پائی جاتی ہے اس کا اصل سبب پنجابی نہیں بلکہ باستثنائے برج بھاشا نواح دہلی کی تمام بولیوں (کھڑی بولی، میواتی اور ہریانی) کی یہ عام خصوصیت ہے۔ جس کا سلسلہ شورسینی اپ بھرنش سے ملتا ہے۔

جدید اُردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
آٹھ	آٹھ	اَٹھّ	
آگ	آگ۔ آگی	اَگّ	
آدھا	آدھا	اَدّھا	ادھ (سب رس)
آنکھ	آنکھ۔ آنکھی	اکھّ	
آگے	آگے	اَگےّ	اگے (سب رس)
آج	آج	اَجّ	
اوپر	اوپر	اُپّر	اُپر (شہ پارے)
ایک	ایک	اِکّ	
بھوکا	بھوکھا	بھکاّ ۔ بکھّا	
پوت	پوت	پت ۔ پتّر	

جدید اُردو	برج بھاشا	پنجابی	دکنی
پھول	پھول	پھُلّ	پھُل
چاند	چاند - چندر	چند	چاند-چندر
سات	سات	ستّ	
کام	کام	کمّ	
لاکھ	لاکھ	لکھّ - لکّ	لکھ - لک (معراج العاشقین)
لاج	لاج	لجّ	
ہاتھ	ہاتھ	ہتھّ	ہاتھ - ہتھ (نصرتی)
مچھّر	مچھر	مچھر	
مٹّی	ماٹی	مٹّی	ماٹی (معراج العاشقین)
سچ	سانچ	سچّ	سانچ - سچّ
ہاتھی	ہاتھی	ہاتّھی	ہتی (سب رس)
میٹھّی	موٹھی	میٹھّی	موٹھی (سب رس)
مانگتا	مانگتا	منگدا	منگتا (سب رس)
منہ	منہ	موں	موں (سب رس)
بتّی	باتی	بتّی	باتی (شہ پارے)
پتّہ	پات	پتّہ	پات (شہ پارے)

دکنی اور پنجابی کے بُنیادی اختلافات

(۱) حروف ہجا میں اُردو کے ڈھ۔ جھ۔ گھ۔ بھ اور دھ کا تلفظ پنجابی میں مختلف طریقہ پر ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ (ہ) پنجابی الفاظ کے صرف شروع میں آتی ہے' درمیانی کو اہلِ پنجاب ایک خاص لہجہ میں بدل دیتے ہیں۔ عام طور سے یہ "ر" کی آواز اختیار کر لیتی ہے۔ جیسے: شہر = شیرٗ' لاہور = لوٗاَور' یا بھوک = پوکھ' دھیان = دی آن' گھوڑا = کوڑا' سمجھ = سمج' کچھ = کج۔

اس کے برخلاف کھڑی بولی' برج بھاشا وغیرہ میں (ہ) کا تلفظ واضح طور سے ادا کیا جاتا ہے مثلاً بارہ آنہ' ڈھول' جھاڑ' پڑھنا' دھونا' بھائی۔ (ہ) کو (ر) میں بدل دینے کے رجحان کو نو وارد ترکوں اور پٹھانوں نے مزید تقویت دی۔ فارسی اور ترکی میں یہ آوازیں مفقود ہیں۔

لیکن پنجابی میں افعال کے آخر میں عام طور سے لہجہ کو بلند بنانے کے لئے اس (ہ) کا بلا ضرورت بھی اضافہ کر دیا جاتا ہے مثلاً کرہو = کرو' جانہہ = جان' رہاتیں = راتیں' اس کی مثالیں قدیم زمانے سے مل جاتی ہیں۔

آدگرنتھ صاحب[۱] : ص ۱۲/۱۲ سبھ (سب) ص ۲/۱۲ بھوکھ (بھوک) ص ۲/۸' گاوہیں (گاویں) ص ۲۱/۲۱ جانیہہ (جانی) ص ۱۵ پر ہے

تو دریاؤ سبھ تجھ ہی مانہہ   تجھ بن دوجا کوئی ناہ

یہ خصوصیت ہمیں کھڑی اور ہریانی میں بھی ملتی ہے: افضل کے بارہ ماسہ (نمونہ

---

[۱] بھائی جودھ سنگھ گیانی: نول کشور اُردو ایڈیشن ۱۹۰۶ء

پنجاب میں اُردو[۲] میں پپیہہ (پپیا)، بکھ (بھیک)، پاری (پائی) جلاہے (جلائے) چلاہی (چلائی)، چڑاہی (چڑھائی)، باجھ (باج ع۔ یا باج پیالا پیا جائے نا۔ قطب قلی شاہ)، شیخ محبوب عالم کے نمونے میں بھی "باجھ" ملتا ہے۔

(۲) اُردو میں ایک مزید آواز (ڑھ) ہے جو پنجابی میں نہیں ملتی[۳]۔ یہ ایک علیحدہ اور مستقل آواز ہے۔ جو جدید دکنی میں پائی جاتی ہے[۴]۔ قدیم دکنی میں "ڑھ" کا تلفظ "ڑ" کے مانند کیا جاتا تھا بلکہ بیشتر اُس کی قدیم شکل "ڈ" یا "ڈھ" کو برقرار رکھا جاتا تھا۔ مثلاً بڈا۔ بڈائی۔ چڈا وغیرہ۔

ضمائر

زبان کے کینڈے کو متعین کرنے اور دیگر زبانوں سے اس کے صحیح رشتے کو بتانے میں ضمائر کو جو اہمیت حاصل ہے اس کو سب قواعد نویسوں نے تسلیم کیا ہے۔ دکنی اور پنجابی کے بنیادی اختلافات ضمائر سے اچھی طرح اُجاگر ہو جاتے ہیں۔ میں، میرا (س۔ ر ص ۲۵/۸)، توں (ق ۲۱/۹)۔ تیرا (س۔ ر ۲۵/۸) واحد متکلم اور واحد مخاطب ضمائر سے قطع نظر دونوں زبانوں کے بیشتر ضمائر ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

واحد غائب۔ حالتِ فاعلی: پنجابی (ایہہ): دکنی میں عام طور سے یو (س۔ ر ۲۳۰/۲) ملتا ہے۔ موجودہ دکنی میں یے اور یہ بھی استعمال ہوتے ہیں۔

---

[۲] صفحہ ۱۸۶۔ ۱۸۷

[۳] پنجابی اور ہندی کا سامانیہ بھاشا وگیان: دنی چند: لاہور

[۴] ہندوستانی صوتیات (انگریزی)؛ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور: صفحہ ۹۲

حالت اضافی: واحد ہو یا جمع پنجابی کی حالت اضافی دکنی سے ہمیشہ مختلف ہو گی۔ پنجابی میں (کا۔کی۔کے) کی بجائے (دا۔دی۔دے) آتے ہیں۔ جس کی ایک بھی مثال باوجود کوشش اور تحقیق کے پروفیسر شیرانی کو دکنی ادب میں نہ مل سکی۔

حالت مفعولی: یہی حال حالتِ مفعولی کا ہے۔ پنجابی میں یہ "نون" کے اضافہ سے بنائی جاتی ہے۔ ہریانی میں بھی "نون" ملتا ہے لیکن اُردو ادبیات میں (دکنی ہو یا شمالی ہند کی) اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔

ضمائر کی جمع میں دونوں زبانوں کا اختلاف اور زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے یہاں دُور کی بھی نسبت معلوم نہیں ہوتی۔

فاعلی جمع متکلم:۔ پنجابی میں "اسی" جو اُردو یا دکنی میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوا۔ دکنی میں زیادہ تر "ہمیں" آتا ہے۔ مثلاً سب رس صفحہ ۱۴۶ ہمیں بی عجب مرد ہیں۔ دیگر صفحہ ۸۰ اور صفحہ ۲۵۹ سب رس میں "ہم" بہت کم ملتا ہے۔

مفعولی جمع متکلم: دکنی میں زیادہ تر "ہمنا" یا "ہمنا کوں" آتا ہے۔ جیسے سب رس ص ۱۱۸ "اپنے باطن کی صورت ہمنا کوں دکھاو دیس۔ ر ص ۳۰۰ ہمنا یاد کرے گا۔

اضافی جمع متکلم: پنجابی: ساڈا، اساڈا : دکنی: ہمارا۔ ہمن (ق ۱۴/۳)

فاعلی جمع حاضر: پنجابی: تُسیں : دکنی: تم (ق ۲۱/۹)

اضافی جمع حاضر: پنجابی: توہاڈا، تُساڈا : دکنی: تارا (ق ۱۷/۹) تمن (ق ۱۷/۹)

فاعلی جمع غائب: پنجابی: ایہہ : دکنی: یو جو واحد کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اضافی اور مفعولی حالت غائب: میں پنجابی "وا" اور "نون" علامتوں کی وجہ سے دکنی سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے جس میں "کا" اور "کو" آتے ہیں۔

ضمائرِ غائب میں پنجابی 'اوہ' کی بجائے دکنی میں "وو" (ق ۶۲/۳) آتا ہے۔ قلی قطب شاہ (۲۵۵/۲) میں محض (اُ) بھی ملتا ہے۔ ان کے علاوہ اُن (ق ۵۵/۴) اور اُسے (س.ر ۵/۱۰) بھی ملتے ہیں۔

ضمائرِ اشارہ میں پنجابی اِتا (اتنا) اور اُتا (اتنا) دکنی میں نہیں ملتے۔ اِتّا اور اُتّا آتے ہیں۔

ضمائر کے نقطۂ نظر سے قدیم دکنی کا نواحِ دہلی کی بولیوں (کھڑی، برج اور ہریانی) سے گہرا تعلق ہے۔

اعداد:-

زبانوں کے رشتے اعداد سے بھی متعین کئے جا سکتے ہیں۔ حروف کی طرح یہ بھی کافی حد تک تغیر پذیر نہیں ہوتے۔ عام طور سے ہندوستان کی جدید آریائی زبانوں کے اعداد ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ پنجابی اور دکنی کے بعض اختلافات ذیل سے معلوم ہو جائیں گے۔

پانچ :- پنجابی (جدید و قدیم دونوں) میں پنج (سنسکرت پنچ) مستعمل ہے جو دکنی اور ہریانی میں نہیں ملتا۔

تین :- پنجابی میں پراکرت 'تنی' سے نکلا "ترِنّ" اور سنسکرت[1] "تری نی" سے نکلا 'ترائی' دونوں مستعمل ہیں۔ دکنی میں 'ترائی' نہیں ملتا۔ پنجابی کا یاراں (گیارہ) بھی قدیم اُردو میں معدوم ہے۔ بعض صوفیا کے ملفوظات میں اگیارہ ضرور ملتا ہے۔

---

[1] ہندی بھاشا کا اتی ہاس: دھیریندر ورما: ص ۲۴۳

بیس: پنجابی: دِی سنسکرت ونشی سے زیادہ قریب ہے۔ دکنی کا بیس پراکرت کی "بسی" سے ماخوذ ہے۔ "س" کو ادا نہ کرنے کا جو رجحان پنجابی میں ملتا ہے دکنی میں مفقود ہے۔ چنانچہ پنجابی میں اُنیس کا اُنیّ۔ اکیس کا اِکی۔ تیس کا تیہہ۔ اکتیس کا اِکتی۔ پینتیس کا پینیھ اور چالیس کا چالی۔ ملتا ہے[1]۔ البتہ وہ اعداد جن کے لئے آخر میں حرف علت آتا ہے۔ غنّہ کے ساتھ ادا کئے جاتے ہیں۔ موجودہ دہلی کے باشندوں کی خصوصیت ہے۔۔ جیسے باراں[12] تیراں[13] سولاں[16] ستراں[17] (پنجابی ستاراں[17]) وغیرہ۔

پچاس:- پنجابی میں پنجاہ ہے۔ اس کی نسبت سے اکاون[51]۔ اکونجا وغیرہ ہو جاتے ہیں۔

برج بھاشا اور قدیم و جدید اُردو کے اکثر عدد مشترک ہیں۔ مثلاً ایک۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ چھ۔ آٹھ۔ نو۔ دس۔ بیس۔ اکیس۔ لاکھ (برج بھاشا دیاکرن صہ۶۲ دھیریندر ورما)۔

افعال:-

جہاں تک افعال کا تعلق ہے دکنی اور پنجابی میں بعض مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں اور بعض اہم اور بنیادی اختلافات بھی۔

(۱) پنجابی میں حالیہ ناتمام مادہ میں (دا) بڑھانے سے بنتا ہے۔ یہ شکل قدیم و جدید اُردو میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوئی۔ جس کی مخصوص علامت (تا) ہے جو ہریانہ اور کھڑی بولی کے اضلاع میں نمایاں طور سے ملتی ہے۔ برج بھاشا میں یہ مخفف (ت) بن کر رہ

---

[1] مزید مثالیں: کیہا (کیسا)، جیہا (جیسا)، کہیں (کسی)، اوہ (اس)، دہ (دس)، دربدا ہے (برستا ہے)، سوہرا (سسرا)، گیاہ (گھاس)، سرہوں (سرسوں)۔

جاتی ہے۔

مادہ	حالیہ ناتمام پنجابی	حالیہ ناتمام دکنی اور اُردو
مر	مردا	مرتا
نکل	نکلدا	نکلتا۔ نکستا
پی	پیندا	پیتا
جی	جیوندا	جیتا
کہہ	کہیندا	کہتا (دکنی کتا)

اس سلسلہ میں پنجابی کی یہ خصوصیت بھی قابل غور ہے کہ حروف علت پر ختم ہونے والے مادّوں میں حالیہ ناتمام بنتے وقت (غنّہ) کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ جو اُردو اور دکنی میں معدوم ہے۔

(۲) مستقبل میں (گا۔ گی۔ گے) کے علاوہ جو اُردو اور دکنی اور پنجابی میں مشترک ہیں۔ (دا) کی علامت بھی استعمال ہوتی ہے[1] جس کی کوئی مثال اُردو کی قدیم و جدید ادبیات میں نہیں ملتی۔ جس طرح دکنی میں برج کی علامت مستقبل (ہ) مفقود ہے۔ اسی طرح پنجابی کی علامت مستقبل (دا) بھی۔

(۳) افعال امدادی میں بلحاظ تلفظ اور صور دونوں زبانوں کا اختلاف اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔

---

[1] پنجابی مینول اور گرامر: بیلی: ص ۲۱۹

واحد		جمع	
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں آں	میں ہوں	اساں آں	ہم ہیں
توایں	تو ہے	تسی اُو	تم ہو
اوہ اے	وہ ہے	اوہ ایں	وہ ہیں

خاص طور سے متکلم واحد کے صیغہ میں "آں" یا "ہاں" کی شکل کہیں نہیں ملتی۔
ماضی میں بُنیادی اختلاف اور اُجاگر ہو جاتا ہے۔ پنجابی میں 'اسا' کی مختلف شکلیں ملتی ہیں۔ دکنی میں 'تھا' یا 'اتھا' کی۔

واحد		جمع	
پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
میں ساں	میں تھا (اتھا)	اسی ساں	ہم تھے (اتھے)
توسائیں	توں تھا (اتھا)	تسی ساؤں	تم تھے (اتھے)
اوہ سی	وہ تھا (اتھا)	اوسن	وہ تھے (اتھے) (ق یم ص ۱۹۲)

(۴) حالیہ ناتمام اور افعال امدادی کے مختلف ہونے کی صورت میں مرکب افعال مثلاً ماضی ناتمام (میں کردا ساں) بھی لازمی طور پر مختلف ہو جاتے ہیں۔

(۵) افعال مرکب: کسی کام کے ختم کر دینے کو پنجابی میں عام طور سے بہنا (بیٹھنا)

رہنا، ہٹنا اور چکنا سے ظاہر کرتے ہیں۔

اُردو اور دکنی میں رہنا، بیٹھنا اور بالخصوص ہٹنا اس طرح سے مستعمل نہیں، ان میں "چکنا" زیادہ فصیح اور بامحاورہ ہے۔ "چکنا" پنجابی میں اُردو سے لیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ صرف شہروں میں مستعمل ہے۔ دیہاتوں میں شاذونادر سُننے میں آتا ہے[1]۔ ہریانی تک کے علاقے میں "چکنا" کا مفہوم "لیا" سے ادا کیا جاتا ہے۔

ایک اور بڑا اختلاف یہ ہے کہ اُردو میں سنسکرت (کتا = क्त) کا (ت त) ہمیشہ حذف ہو جاتا ہے۔ پنجابی میں یہ کبھی نہیں ہوتا۔ جیسے۔

س : کرِتہ اُردو : کیا پنجابی : کیتا

س : دِتہ اُردو : دیا پنجابی : دتّا

س : سپتہ اُردو : سویا پنجابی : سُتّا

پنجابی میں کیتا، دتّا وغیرہ میں (ت = त) کا برقرار رکھنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا تعلق لہندا سے بہت گہرا رہا ہے۔ دکنی میں کہیں کہیں کیتا کی شکل نظر آجاتی ہے۔ جیسے کیتا آواز۔ کیتی عرض (اُردو شہ پارے : مثنوی بہرام بانو۔ امین ص۲۱۲) لیکن یہ اس میں مستقل صورت نہیں۔ اور بعد کو متروک سمجھی جانے لگی۔ پھر یہ کہ دِتّا۔ سُتّا وغیرہ کی مثالیں نہیں ملتیں۔

حروف :-

(۶) پنجابی کے بعض عام مستعمل حروف دکنی میں نہیں ملتے۔

نوں = (کو) : دکنی میں کو یا کوں مستعمل ہے۔ نوں، پانی پت اور کرنال کے اضلاع

---

[1] پنجابی مینول اور گرام : بیلی : ص۲۲۲

تک سُنائی دیتا ہے۔

وِچ = اُردو دکنی 'بیچ' یا 'میں' وِچ قدیم و جدید پنجابی کے ساتھ مخصوص ہے۔ (ص ۱۴/۲ آدگرنتھ صاحب) گو "میں" بھی آدگرنتھ میں پایا جاتا ہے۔

نال: (ص ۱۴/۲ آدگرنتھ) اُردو دکنی کے ساتھ، سنگ (ف۔ق۔م) کا مترادف ہے۔

توڑی، تارڑی: تک کے معنوں میں آتا ہے۔ دکنی میں "لگ" ہے جو آدگرنتھ (ص ۲۵/۲) میں بھی بہ کثرت ملتا ہے اور لاہور سے لے کر اودھ تک کے دیہاتی رقبوں میں آج بھی سُنا جاتا ہے۔

کول، کولے: پاس کے معنوں میں پنجابی میں مستعمل ہے۔ دکنی میں مفقود ہے۔

وانگوں، وانگر: مثل کے معنوں میں آتا ہے۔ دکنی میں سنسکرت کا سم (ف۔ق۔م) بھی مستعمل تھا۔

نیڑے: نزدیک۔ دکنی (نزیک ق۔ق۔م) یا کنَ۔ کنے (ف۔ق۔م) پنجابی سے مخصوص ہے۔

سمت کے اظہار کے لئے پنجابی میں ارے، ارار، ولی، سوا وغیرہ آتے ہیں۔ جو دکنی میں نہیں ملتے۔

ہُن: (اب) دکنی میں اب اتال یا ہے (ف۔ق۔م) آیا ہے۔

پنجابی میں مختلف اوقات کے اظہار کے لئے ویلا (بیلا) اضافہ کر دیتے ہیں مثلاً دتمی ویلا (علی الصباح)، یہ شکل دکھنی میں نہیں ملتی۔

پنجابی میں 'بھیتر'، کم اور 'انڈر' زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ دکنی میں 'بھیتر' کے

ساتھ 'بھتراں' (ف۔ق۔م) کی شکل بھی نظر آتی ہے۔

(۷) پنجابی زبان کے بعض عام مستعمل اسماء اور افعال دکنی میں نہیں ملتے۔

اسماء: پیو (باپ)۔ بھرا (بھائی)۔ پُت۔ پُتر (بیٹا)۔ وا (ہوا) ویر (بیر، دشمنی)۔ وست: چیز) وہٹی۔ رن (بیوی)۔ دِھی۔ کاکی۔ کڑی (بیٹی۔ لڑکی)۔ ککڑ (مرغ) وال۔ کیس (بال)۔ روکھ (دکنی۔ جھاڑ: درخت) لکا (چھوٹا)۔ وا (ہوا) واج (آواز) وروڈھ (دشمنی)۔

افعال: گھالنا (بمعنی بھیجنا جو جدید پنجابی میں مستعمل ہے (پہچانا: آدگرنتھ صفحہ ۴۴/۲)۔ دھیانا (ا۔گ صہ ۵۴/۶) بھیا۔ بھے (ہوا۔ ہوئے۔ ا۔گ صہ ۲۶/۱) وسارنا (دکنی بسرنا۔ ا۔گ صہ ۲۵/۷) دیکھنا (دیکھنا۔ ا۔گ صہ ۹/۶)۔

یہاں یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ صوتی اعتبار سے بمقابلہ پنجابی دکنی "ب" کی آواز کو پسند کرتی ہے۔ پنجابی میں وال (بال)۔ وچارنا (بچارنا)۔ وسارنا (بسرنا) وغیرہ آتے ہیں جو مغربی ہندی کے صوتی اصولوں پر ڈھل کر دکنی میں مستعمل ہوتے ہیں۔

مزید مثالیں

پنجابی	دکنی	پنجابی	دکنی
وکھ، وس	بس	وات	بات
واگاں	باگاں (جمع باگ)	وچارنا	بچارنا (ف۔ق۔م)
ویچنا	بیچنا	وسنا	بسنا
وار	بار	وست (چیز)	بست (ف۔بی۔ر)
وڈھائی	بڈائی (ف۔بی۔ر)	ورت	برت (روزہ)

---

[1] ا۔گ۔ سے مراد "گرو گرنتھ صاحب آد" مطبوعہ نولکشور پریس: اردو ایڈیشن ۱۹۱۷ء ج ۱ سے مراد صفحہ ۲۷ سطر۔

قدیم دکنی اور پنجابی کے مذکورہ بنیادی اختلافات کے باوجود پروفیسر شیرانی کے اس دعویٰ میں کافی حد تک صداقت ملتی ہے کہ قدیم دکنی پنجابی سے مماثل ہے لیکن صوتیاتی اور صرفی و نحوی لحاظ سے دکنی کے "پنجابی پن" کی توجیہہ نواحِ دہلی کی تین بولیوں (کھڑی ہریانی اور میواتی) سے بھی ہو سکتی ہے۔ کھڑی بولی کے ارتقا کے بارے میں غود گریرسن نا متضاد باتیں لکھ گیا ہے۔ ایک طرف وہ پنجابی کو 'ملواں' زبان کی صف میں جگہ دیتا ہے، دوسری طرف کھڑی بولی کو وہ برج بھاشا کی ایک ایسی شکل مانتا ہے جو پنجابی میں بتدریج ضم ہوتی چلی گئی ہے۔ تیسری طرف مجموعی حیثیت سے حکم لگاتے ہوئے وہ اور چارلس لائل دونوں کھڑی بولی کو برج بھاشا سے دوسری بولیوں کی بہ نسبت قریب تر کہتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ برج بھاشا کھڑی بولی سے بہت پہلے ادبی شکل اختیار کر چکی تھی۔ قدیم اردو پر پنجابی زبان کے بعض اثرات کا تسلیم کرنا بھی ناگزیر ہے۔ جس نے "زبانِ دہلوی" کے ارتقا میں مہمیز لگائی۔ لیکن حقیقت یہ ہے جیسا کہ ڈاکٹر چیٹرجی نے اپنی تصانیف میں اشارہ کیا ہے[1]۔ قدیم عہد میں لاہور سے لے کر الہ آباد تک کی زبان میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ مغربی یو۔پی اور مشرقی پنجاب کی بولیاں آج بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں، اُس زمانے میں اور زیادہ قریب تھیں۔ جدید آریائی بولیوں کے طلوع کا زمانہ ۱۰۰۰ء سے پیچھے نہیں لے جایا جا سکتا۔ اسی لئے قدیم دکنی کا جواز جدید پنجابی میں نہیں ڈھونڈھنا چاہیئے۔ بولی کی حیثیت سے اگر کسی کو قدیم دکنی سے گہری نسبت ہو سکتی ہے تو وہ دہلی کے نواح کی دو بولیاں ہیں یعنی کھڑی اور ہریانی۔ اس سلسلے میں برج بھاشا اور میواتی کو اور ملحوظ

---

[1] انڈو ایرین اور ہندی: چیٹرجی ص ۱۶۷

رکھنا ہوگا۔ کیونکہ شہرِ دہلی ان تمام بولیوں کے نقطۂ اتصال پر واقع ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دکنی کے "پنجابی پن" کی توجیہہ حسبِ ذیل اضلاع کی بولیوں سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) کھڑی کے اضلاع : میرٹھ، سہارن پور، مظفر نگر

(۲) ہریانی کے اضلاع : کرنال، رہتک

(۳) میواتی کا ضلع : گڑگاؤں

(۴) برج کا ضلع : بلند شہر

ان میں دکنی اور قدیم اردو کے نقطۂ نظر سے میرٹھ، رہتک اور گڑگاؤں کے اضلاع کی بولیاں بہت اہم ہیں۔ انہیں علاقوں کے رہنے والوں پر قدیم دہلوی سماج کے وہ مختلف طبقات قائم ہوئے تھے جو کئی قسم کی ملی جلی زبان بولتے تھے۔ ان سب پر ترک افغانی سماج کا ٹھپہ تھا اور ابتدا میں شہرِ دہلی میں خسرو کی "زبان لاہوری" کا اثر بھی تھا محمود شیرانی اور ڈاکٹر زور دونوں اپنی تحریروں میں یہ بات ثابت کرنے سے قاصر ہیں کہ پنجاب سے کبھی بھی اتنے وسیع پیمانے پر ہجرت ہوئی ہے جس کی مثال موجودہ شہر دہلی ہے۔ آج بھی کئی لاکھ کی آبادی کے رد و بدل کے باوجود قطع نظر شہر دہلی کے آس پاس کے اضلاع کی بولیوں کا اقتدار قائم ہے۔

پروفیسر ژول بلوک نے اپنی تحریروں میں اردو کی ابتدا کے سلسلہ میں صرف ہریانی زبان پر زور دیا ہے۔ ڈاکٹر زور نے "ہندوستانی لسانیات" میں ہریانی کے اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔ اردو کی ابتدا اور ارتقا کے سلسلے میں جس نظریے کا خاکہ ہم نے اس کتاب میں تیار کیا ہے۔ اس میں زور نواحِ دہلی کی ان تمام بولیوں پر ہے جن کے سنگم پر شہر دہلی واقع ہے۔ دکنی کی غرابت اسی وقت تک قائم رہتی ہے جب تک کہ ہم معیاری

اُردو سے قطع نظر نواحِ دہلی کی بولیوں کا لسانی جائزہ نہیں لیتے۔ محمود شیرانی کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اُنھوں نے پنجابی اور دکنی کی مماثلت اپنی تصنیف میں پیش کی۔ جدید تحقیق صرف اس بات کی منتظر تھی کہ دکنی کی اِن خصوصیّات کو جنھیں پنجابی سے منسوب کیا گیا ہے نواحِ دہلی کی بولیوں سے ثابت کردے۔ کیونکہ پچھلے ابواب میں یہ بات تو مسلّم ہو گئی ہے کہ ہریانی اور کھڑی (نواحِ دہلی کی بولیاں) مسلمانوں کی فتح دہلی کے بعد کا ارتقا نہیں۔

اس تحقیقی کام کے سلسلے میں تاریخی مواد ہم صرف ہریانی کا فراہم کرسکے ہیں۔ کھڑی اور میواتی کی جدید شکلوں ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ کھڑی کے سلسلے میں شمالی ہند کی اُردو کے قدیم ادبی نمونوں پر بھی نظر رکھی گئی ہے۔

دکنی کی بعض خصوصیات کی توجیہ نواح دہلی کی بولیوں سے

(۱) قدیم و جدید ہریانی سے

قدیم دکنی زبان کے مطالعہ کے سلسلے میں اب تک ہریانی کو بالکل نظرانداز کیا گیا ہے۔ حالانکہ یہی زبان ہے جو قطع نظر شہر دہلی، ضلع دہلی میں آج بھی بولی جاتی ہے۔ پروفیسر شیرانی اسے قدیم اُردو کی ایک شکل گردانتے ہیں۔ اُردوئے قدیم سے متعلق لسانی تحقیق کے سلسلہ میں جو اہمیت اس کو حاصل ہے۔ اس کی طرف سب سے پہلے اشارہ پروفیسر ژول بلوک نے اپنے ایک مضمون "ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل" میں کیا ہے۔ پروفیسر موصوف لکھتے ہیں[۱]:

"اس میں شک نہیں کہ پنجاب پہلا صوبہ ہے جو مسلمانوں کے زیر اقتدار آیا۔ اور عرصہ تک رہا۔ اسی لئے پنجابی اور اُردو کی مماثلت یاد رکھیے لیکن یہ اس قیاس کے مانع

---

[۱] بلیٹن اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز: جلد ۵ : صفحہ ۱۹۲۸-۳۰۔

نہیں کہ ہندی لشکروں کے وہ لوگ جو پہلے پہل اپنی زبان کو دکن لے گئے۔ پنجاب سے
متعلق تھے۔ بلکہ مشرقی پنجاب کے ضلع انبالہ اور شمالی دوآبہ سے تعلق رکھتے تھے۔
مغربی روہیلکھنڈ کے متعلق میں تحقیق سے نہیں کہہ سکتا کیوں کہ ان اضلاع کی اُردو
نُما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔"

آگے چل کر پھر لکھتے ہیں:۔

"لہٰذا میرے خیال میں مشرقی پنجاب کے اضلاع کی زبان لشکریوں کے ذریعے دکن
تک پہونچتی ہے جس نے مرورِ ایام سے شُستہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔[1]"

(ص ۶۲۹-۶۳۰، B.S.O.S ۱۹۲۸-۱۹۳۰)

بعد کو ہریانی کی اہمیت کے بارے میں ڈاکٹر زور اپنی کتاب 'ہندوستانی لسانیات' میں
یوں رقمطراز ہیں:۔

"یہاں ایک اور بات مدِّ نظر رکھنی چاہیئے کہ اُردو پر بانگرو یا ہریانی زبان کا بھی قابلِ
لحاظ اثر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ زبان دہلی کے شمال مغرب میں انبالہ کے اطراف
میں اُس علاقہ میں بولی جاتی ہے جو پنجاب سے دہلی آتے ہوئے راستہ میں واقع ہے۔
اور دہلی پر حملہ کرنے والوں یا وہاں کے حکمرانوں کے ہمراہ اُسی علاقہ کے رہنے والے
بھیر و بنگاہ کی حیثیت سے دہلی اور اس کے نواح میں آ کر آباد ہوئے جس کا نتیجہ یہ
ہوا کہ فاتح و مفتوح کے میل جول سے جو زبان بنتی چلی آ رہی تھی اس میں ہریانی عنصر
بھی شامل ہو گیا۔" (ص ۹۰ لسانیات: ۱۹۳۲ حیدر آباد دکن)

مذکورہ بالا اشارات سے لسانیاتی تحقیق کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے لیکن ہریانی

---

[1] "ہند آریائی لسانیات کے بعض مسائل" B.S.O.S جلد ۵ (۱۹۲۸-۱۹۳۰)

سے متعلق لسانیاتی تحقیق کے سلسلے میں بعض دشواریاں بھی حائل ہیں۔

(۱) قدیم ادبی نمونوں کا فقدان۔

(۲) ہریانی زبان کی کسی قواعد کا دستیاب نہ ہونا۔

پہلی کمی کو پروفیسر شیرانی کے اِن مضامین نے کسی حد تک پورا کر دیا ہے جو اورنٹیل کالج میگزین کے (نومبر ۱۹۳۱ء اور فروری ۱۹۳۲ء) کی جلدوں میں شائع ہوئے ہیں۔ اس طرح ہمارے سامنے ہریانی کے کئی قدیم مصنّفوں کے ادبی نمونے آجاتے ہیں۔ جن میں شیخ عبداللہ انصاری: شیخ محبوب عالم ساکن جھجّر۔ اکرم شاہ کی المتخلص بہ قطبیؔ، شاہ عبدالحکیم۔ شاہ غلام جیلانی رہتکی قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ بالا مصنّفوں کے علاوہ لسانی نقطۂ نظر سے سب سے زیادہ قابل قدر تصانیف عہد عالم گیری کے مشہور فارسی داں میر عبدالواسع ہانسوی کی صمد باری اور فرہنگ غرائب اللغات ہیں۔ صمد باری، خالق باری کے طرز پر لکھی ہوئی تین زبانوں کی فرہنگ ہے۔ غرائب اللغات کا اصل نسخہ مفقود ہے۔ البتہ سراج الدین علی خاں آرزو کے تصحیح شدہ قلمی نسخے "تصحیح غرائب اللغات ہندی" کے نام سے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں۔[۱] خان آرزو عبدالواسع کی زبان کو معیاری نہیں مانتے۔ ہانسی چونکہ ہریانہ کے علاقہ میں ہے۔ اس لئے ہندی الفاظ کی فصاحت کا معیار عبدالواسع یہیں کی بولی سے متعین کرتے ہیں۔ خان آرزو "زبان وطن مصنّف" یعنی ہریانی کو فصیح نہ مان کر برج یا گوالیری کو "افصح السنہ ہند" قرار دیتے ہیں۔[۲]

---

[۱] کتاب مذکورہ کے دو قلمی نسخے لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی میں بھی محفوظ ہیں۔ حال میں اسے ڈاکٹر سید عبداللہ نے "نوادر الالفاظ" کے نام سے مرتب کر کے انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے شائع کیا ہے۔ (۱۹۵۱ء)۔

[۲] قلمی نسخہ تصحیح غرائب اللغات ہندی: لٹن لائبریری۔

دوسری یعنی قواعد کی کمی کو کسی حد تک اُن لسانی نوٹوں سے پورا کیا گیا ہے۔ جو راقم السطور نے دہلی کے مضافات سے مختلف ذرائع سے حاصل کیے ہیں۔ گریرسن کے عدیم المثال لسانیاتی تبصرۂ ہند میں بھی اس غریب بولی کے متعلق تفصیل سے نہیں لکھا گیا۔ نہ تو اس کی قواعد کا دیگر بولیوں کی طرح خاکہ دیا گیا ہے۔ اور نہ ہی فرہنگ میں اس کے الفاظ کو جگہ دی گئی ہے۔ ہریانی زبان کی جاٹو زبان کے نام سے ایک مختصر سی فرہنگ جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال سنہ ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی جس کے مصنف مسٹر ای جوزف آئی، سی، ایس تھے۔ گریرسن نے اپنے "لسانیاتی تبصرۂ ہند" میں اس سے پورا پورا استفادہ کیا ہے۔

(۱) ہریانی اور قدیم دکنی میں بعض صوتی مماثلتیں پائی جاتی ہیں۔ ہریانی میں اُردو کی 'ڑ' کی جگہ 'ڈ' کا استعمال کثرت سے پایا جاتا ہے۔ دکنی میں اس کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔

مُلّا وجہی نے سب رس اور قطب مشتری میں (دیکھیئے فرہنگ) چھوڑ کو چھوڈ۔ پڑھے کو پڈھے۔ بڑا کو بڈا۔ چڑھنا کو چڈھنا۔ لکھا ہے۔ جو بعینہٖ ہمیں ہریانی کے قدیم مصنّف شیخ عبدی کے، فقہ ہندی (سنہ ۱۰۴۷ھ) میں ملتے ہیں۔[۱] (ڑ) پر (ڈ) کو ترجیح عبدالواسع نے بھی دی ہے مثلاً اساڑھ کی بجائے اساڈھ۔ بُڑھس کی بجائے بڈھس۔ بڑھنا کی بجائے بڈھنا۔ بھیڑ کی بجائے بھیڈ۔ پیڑ کی بجائے پیڈ۔ جو آج بھی ہریانوی اور کھڑی کے ملحقہ علاقوں میں مستعمل ہیں۔

شیخ عبدی کے فقہ ہندی میں ہمیں ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جس میں ہریانی زبان کے

---

[۱] اورنٹیل کالج میگزین نومبر ۱۹۳۱ء: ہریانی زبان میں تالیفات: شیرانی

عام اصول کے مطابق حرف کی حرکت سے متاثر ہو کر ثانی حرفِ علّت کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔

مثلاً برائی = بورائی رکھے = راکھے

سچ = سانچ سکھانا = سکھاونا

تئیں = تائیں ہڈی = ہاڈ

لہو = لوہو

غرائب اللغات :۔

باندھ بجائے بند : باندر بجائے بندر

ساتو بجائے ستو

پھوکنی بجائے پھکنی تاپ بجائے تپ

ان میں اکثر الفاظ قدیم دکنی ادبیات میں اسی تلفظ کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ راکھے۔ تائیں۔ ہاڈ اور لوہو کے لئے دیکھئے فرہنگ سب رس۔ مزید مثالیں شہ پارے جلد اوّل کے فرہنگ سے مل جاتی ہیں۔ بلانا = بولانا، چپاتی = چھوپاتی۔

شیخ محبوب عالم ساکن جھجھر دوسرے ہریانی مصنّف کے محشر نامہ میں لاگا (لگا) ماٹی (مٹی)، راکھوں (رکھوں)۔ چالیں (چلیں)۔ یاڈھ (ہڈی) وغیرہ مل جاتے ہیں[1]۔

دکنی میں غنّہ کے کثرتِ استعمال کی توجیہ بھی پنجابی سے نہیں ہریانی سے کی جا سکتی ہے۔

جیسے دکنی ادبیات کے: سیں (سے)۔ کوں (کو)۔ توں (تو) با علامت مصدر ناکو

---

[1] اورینٹل کالج میگزین، نومبر ۱۹۳۱ء

ناں بولنا (چلناں. کھاناں. جاناں) یا (کو نچے کو نچے بس۔ ر ص ۹۹)۔

سنتانا (ستانا. ف.ق.م) آدمیں آدمی (ف.ق.م)۔ برسانت (برسات. ف.ق.م) وغیرہ براہ راست ہریانی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں ذیل کے الفاظ غنہ کے ساتھ درج ہیں۔

پہلیں (پہلے)، ناچیں. بنجائی (بجائی)۔ ماں (ماس) بیں۔ کوں۔ توں وغیرہ۔

دہلی کے قدیم باشندوں کی گفتگو میں یہ الفاظ آج بھی اسی طرح سنائی دیتے ہیں۔ خالق باری میں "دہی" کی بجائے "دہیں" ملتا ہے۔ ملا وجہی سب رس میں "دہیں" ہی لکھتے ہیں۔

ہریانی اور قدیم دکنی دونوں میں بھ۔ چھ۔ دھ وغیرہ کا تلفظ سہل اور سادہ ہو جاتا ہے۔ جیسے بھی (بی)۔ تجھ (تج)۔ مجھے (مجے)۔ کچھ (کچ)۔

(دیکھئے سب رس اور ہریانی زبان کے نمونے گریرسن: لسانی تبصرۂ ہند جلد نہم حصہ اول)۔

(۲) دکنی اور ہریانی میں جمع بنانے کا طریقہ بھی مشترک ہے۔ دونوں میں اردو کے معیاری قاعدہ "وں" کے اضافہ کے برعکس "اں" لگا کر بناتے ہیں۔ اس کی توجیہ پنجابی سے کی گئی ہے، لیکن ہریانی سے بھی ہو سکتی ہے۔ شیخ محبوب عالم کے محشرنامہ میں جمع اسطور ملتی ہے۔

ٹکراں عزیباں جھوٹاں اونٹاں

لیکن چونکہ اورنگ زیب کے عہد میں اردو جمع بنانے کا قاعدہ متعین ہو چکا تھا۔ اس لئے "کان" کی جمع "کانوں" اور "گمان" کی "گمانوں" مل جاتی ہے۔

جدید ہریانی میں[1] : گھوڑاں ۔ دناں ۔ کھیتاں وغیرہ

(۳) دکنی میں ماضی قریب و فعل حال میں "سے"۔ "سوں" "سیں" اور "ساں" مطلق نہیں ملتے۔ جو پنجابی زبان سے مخصوص ہیں۔ موجودہ ہریانی میں بھی یہ پائے جاتے ہیں۔ لیکن قدیم ہریانی کے مصنفوں کے یہاں نہیں ملتے۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ ہریانہ علاقہ میں یہ بعد کو پنجابی اثرات کے تحت رواج پا گئے ہوں گے (دیکھیے محشر نامہ محبوب[2] عالم)

(۴) اردو کی معیاری فعلیہ شکل کھا کر، جا کر، آ کر کی بجائے شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں یائے زائدہ کے ساتھ آئے کر، کھلائے کر، اٹھائے کر، اور چاکر، پڑھائے کر۔ اور لائے کر ملتے ہیں۔ وجہی کی ایک غزل ۔

پیو اپنے کوں ٹک آج میں سپنے دکھی سوئے کر

میں روئے کر، ہوئے کر، کوئے کر، کھوئے کر قافیہ کے طور پر آئے ہیں۔

پنڈت چندر بھان مخلص بہ برہمن سنہ ۱۶۶۲ء کا مصرع بھی ہے ۔ ع

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے

(۵) افعال امدادی میں ہریانی کے اندر "سوں"۔ "سیں" اور "ہوں"۔ "ہیں" زمانہ حال میں دونوں شکلیں ملتی ہیں۔ دکنی میں پہلی شکل نہیں ملتی۔ جدید ہریانی میں یہ پنجابی کے اثر سے آئی ہے۔

---

[1] (نوٹ) جمع بنانے کا یہ طریقہ نہ صرف دکنی، پنجابی اور ہریانی سے مخصوص ہے۔ بلکہ راجستھانی بولیوں کی عام خصوصیت ہے۔ علاوہ ازیں آج بھی یہ بعض اوقات کھڑی کے علاقے دانبالہ اور مظفر نگر کے اضلاع) میں سنائی دیتا ہے۔

[2] پنجاب میں اردو۔

(۶) موجودہ اُردو کا فعل احتمالیہ ہریانی میں اپنے اصل مفہوم یعنی محض حال کے معنوں میں مستعمل ہے۔ جس کی گردان حسب ذیل ہوگی۔

	واحد	جمع
متکلم	ماروں۔ ماراں (میں مارتا ہوں)	مارائیں۔ ماریں۔ ماراں
حاضر	مارائی۔ مارے	مارو
غائب	مارائی۔ مارے	مارئیں۔ ماریں

جو دکنی سے قریبی مماثلت رکھتی ہے۔

(۷) اُردو میں ایسے مصادر کی ماضی مطلق جن میں علامتِ مصدر سے قبل (ا) یا (و) نہیں ہوتا اس طرح بنتی ہے کہ امر کے آگے (ا) بڑھا دیتے ہیں۔ لیکن دکنی میں بجائے (ا) کے (یا) لگا دیتے ہیں[1]۔ مثلاً ماریا، رہیا، چلیا، کہیا، کھلیا، لگیا قدیم وجدید ہریانی میں یہ بعینہ اسی طرح ملتے ہیں۔ صرف رہتک کی زبان میں کہیا کا کہا، لگیا کا لگا اور چلیا کا چلا ہو جاتا ہے[2] جو یقیناً کھڑی بولی کے اثر سے ہے۔

(۸) دکنی کے ضمائر بھی پنجابی کی بہ نسبت ہریانی سے زیادہ قریب ہیں۔ جن ضمائر کی توجیہ شیرانی پنجابی سے کسی طرح نہیں کر سکے وہ ہریانی میں جوں کے توں ملتے ہیں۔
متکلم جمع: ہریانی میں ہم اور ہمیں آتا ہے: دکنی میں بھی ہم اور ہمیں (ن۔ س۔ ر) مستعمل ہے۔ پنجابی میں اس کے برعکس "اسی" ملتا ہے جو دکنی میں کبھی بھی استعمال نہیں ہوا۔

---

[1] مقدمہ سب رس: عبدالحق
[2] گرامینا ہندی: دھیریندر ورما: ضمیمہ

حاضر جمع: پنجابی تسی ہے: ہریانی تم (کھڑی بولی کے علاقے میں بھی اس کلمہ ہی تلفظ ہے)، اور تمہیں ہے۔ دونوں دکنی میں ملتے ہیں (تمَ کا تلفظ تمُ ہو جاتا ہے)۔

دیگر ضمائر بھی دونوں زبان کے یکساں ہیں۔

ضمائر اشارہ: اُردو: یہ دکنی: یو ہریانی: یو، یوہ

اُردو: اس دکنی: اِس ہریانی: اِس (پنجابی ایس ہے)

اِسی طرح جو۔ جس۔ کون اور کسی بھی مشترک ہیں۔

قدیم ہریانی میں (شیخ محبوب عالم کے محشر نامہ میں) حسبِ ذیل ضمائر ملتے ہیں۔

وہ، یہ، اے، وے، اس، ان، یو، تس، تیں، توں، توہ، تجھ، تم، تیرا، تیرے، تیری، میں۔ مجھ، میرا، میری، ہم، ہمارا۔

جو دکنی اور[1] ہریانی میں مشترک ہیں۔

ضمائر میں تصریف دکنی کے طرز پر ہے مثلاً ہم سے، ہموں، ہمیں، تم سے، تموں، تمہیں۔ اُن سے، اُنہاں، اُنہوں (دکنی انوں)۔

(۹) ہریانی زبان کے عام مستعمل حروف جو اس کی قدیم تالیفات سے اکٹھے کئے جا سکے ہیں حسبِ ذیل ہیں۔

شیخ عبداللہ انصاری[1]: مانہہ، میں، سوں، نانہہ (نہیں) آگوہ (آگے) پچھوں (پیچھے)۔

شیخ محبوب عالم[2]: کو، بہت، میں، ماں، ماہیں، بیچ، بچ، سیں، کوں، پہ،

---

[1] مقدمہ سب رس: عبدالحق

[2] اورنٹیل کالج میگزین: نومبر ۱۹۳۱ء

موں، بیچ ماں، مانجھ (درمیان) اندر۔

علاوہ ازیں تے، تھے اور سیتی عام مستعمل حروف ہیں۔ جو دکنی اور ہریانی دونوں میں مشترک ہیں۔

صرف ہریانی اور دکنی دو ایسی زبانیں ہیں جن میں قدیم زمانے سے حروف "نے" علامت فاعلی اور مفعولی دونوں طرح سے مستعمل ہوتا چلا آیا ہے۔ اردو میں "نے" صرف فاعل کے ساتھ استعمال ہوتا ہے۔ اور وہ بھی افعال متعدی میں۔[1] چونکہ یہ سنسکرت کے مفعول "لگیا" سے نکلا ہے (لگے۔ لے۔ نے) اس لئے بیشتر زبانوں میں یہ علامتِ مفعول ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن اردو میں چونکہ "کو" علامتِ مفعول موجود ہے اس لئے یہ فاعل کے ساتھ مخصوص ہو گیا ہے۔

جدید ہریانی: من نے صاحب نے مارا (مجھے صاحب نے مارا)

(فاعل مفعول ایک ساتھ)۔

قدیم دکنی: فاعل: اس خاطر زلیخانے کیا کری (سب رس ص ۵۶)

مفعول: آدمی برا اچھے تو شراب نے کیا کرنا (سب رس ص ۳۱)

(۲) میواتی سے

پچھلے ابواب میں ہم نے قدیم اردو پر میواتی کے اثرات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ میوات کا ذکر پرتھی راج راسو تک میں ملتا ہے۔[1] میواتی راجستھانی کی شمال مغربی بولی ہے جس کے ڈانڈے ایک طرف برج بھاشا اور دوسری طرف بانگرو سے جا ملتے ہیں۔

---

[1] قواعد اردو: عبدالحق

اس کا مرکز ریاست الور ہے۔ گڑگاؤں کے مغربی حصّے، پٹودی اور ضلع دہلی کے بعض علاقوں میں اس کی بولی اہیرواٹی رائج ہے۔ تحصیل جھجر، دہلی اور رہتک کی اہیرواٹی میں بانگرو کی آمیزش پائی جاتی ہے۔ اہیرواٹی کا مرکز مغربی گڑگاؤں میں ریواڑی کا قصبہ مانا جاسکتا ہے۔ تاریخی نقطۂ نظر سے یہ علاقہ اہیروں (یا آبھیروں) کا ہے جو آٹھویں صدی عیسوی میں مغربی ہندوستان کے بہت بڑے علاقے پر قابض تھے[1] فتح دہلی کے بعد سے میوات نومسلموں کا گڑھ رہا ہے۔

راجستھانی کی طرح میواتی، بانگرو (ہریانی) اور مشرقی پنجابی میں بہت سی مشترک لسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ شیرانی نے اپنے لسانیاتی نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے یہ سوال اٹھایا ہے۔

"اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ دہلی میں مسلمانوں کی آمد کے وقت کونسی زبان بولی جاتی تھی۔ یقیناً وہ راجستھانی ہوگی یا برج"۔[2]

دوسرے الفاظ میں شیرانی نے کھڑی بولی اور ہریانی کی قدامت سے تو انکار کیا ہے لیکن برج کے ساتھ راجستھانی کی قدامت کو تسلیم کیا ہے۔ راجستھانی کی قدامت کو تسلیم کرنا اس لئے بھی ناگزیر تھا کہ راجپوتوں کے عہد کی بیشتر ادبیات سے راجستھانی کے اثرات نمایاں ہیں۔

پچھلے صفحات میں ہم یہ دکھا چکے ہیں کہ قدیم اُردو کا پنجابی پن کس طرح اس کا ہریانی پن بھی ہے۔ ان سطور میں قدیم اُردو (بالخصوص قدیم دکنی) کی بعض خصوصیات کی توجیہہ

---

[1] لسانیاتی جائزہ ہند: جلد نہم: حصہ دوم صہ ۵۰

[2] مقدمہ پنجاب میں اُردو

میواتی بولی سے کی جائے گی جس کی قدامت کے شیرانی بھی مقر ہیں اور جو نہ صرف نواح دہلی بلکہ ضلع دہلی کے جنوب مغربی حصّوں میں رائج ہے۔

(الف) اسمائے جمع :-

واحد	جمع میواتی میں	جمع دکنی میں
گھوڑا	گھوڑاں	گھوڑاں

اسمائے ضمائر :-

میواتی :- میں - تو - مجھ - موُں - میرے - میرو - تج - توں - تیرے - تیرو -

ہم - ہما - ہمارے - ہمارو - تم - تمُ - تمَ - تہارے - تہارو -

اپ - اپنڑا

یو - وو - یا ' وا (مونث) -

کونڑ - جن - کن - جو - جون - جس - اِس - اِن - اُس -

(ب) حروف   کا - کی - کے -

اس لحاظ سے کھڑی بولی ' ہریانی ' میواتی ' برج ' اور دکنی میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ پنجابی اِن سے بالکل مختلف ہے جس میں (دا) کی شکلیں رائج ہیں۔

(ج) افعال :-

افعال میں میواتی کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ (ہے) اور اس کی مختلف شکلوں کی بجائے (سے) اور اُس کی مختلف شکلیں مثلاً میں سوں ' میں ساں (میں ہوں) - ہم سیں ' ہم ساں (ہم ہیں) وغیرہ استعمال ہوتی ہیں جو راجستھانی کی عام خصوصیت ہے۔ صوتی نقطۂ نظر سے میواتی برج کے برخلاف ان تمام رجحانات کی حامل ہے جو ہریانی

یا کھڑی بولی (بالخصوص میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں) پائے جاتے ہیں۔ یعنی مشدد الفاظ کا استعمال، درمیانی حرف علت کی تخفیف (ڑ) پر (ڈ) اور (ڑھ) پر (ڈھ) ترجیح صوتی نقطۂ نظر سے یہ دکنی کی بھی عام خصوصیات ہیں۔

میواتی میں ادبی نمونے ناپید ہیں۔ لوک گیتوں کے علاوہ کوئی قابل قدر چیز نہیں ملتی۔ لیکن دہلی سماج کے نچلے طبقات میں میوات کے رہنے والے مسلم میوؤں کا قدیم زمانے سے اثر رہا ہے۔ جغرافیائی اعتبار سے بھی میوات کا علاقہ دہلی سے قریب ترین ہے۔ اس لئے یہ بعید از قیاس نہیں کہ قدیم اُردو کا پنجابی پن نہ صرف اس کا ہریانی پن ہے۔ بلکہ میواتی پن بھی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ کوئی شخص برج اور اودھی کی ان مشترک خصوصیات کو جو کھڑی بولی میں بھی پائی جاتی ہیں برج سے نہیں بلکہ اودھی سے عبارت کرے۔ پنجابی زبان اور شہر دہلی کے درمیان کم از کم دو بولیاں (ہریانی اور میواتی) حائل ہیں۔ اس لئے لسانیاتی تحقیق کے جو دائرے دہلی کے اِرد گرد قائم ہوتے ہیں۔ ان میں پہلا نمبر ہریانی، کھڑی، میواتی اور برج کا آتا ہے۔ اس کے بعد مشرقی پنجابی یا لاہوری کا۔

(۳) کھڑی بولی سے

ادبی اُردو کا معیار تو یہیں لکھنؤ جا کر متعین ہوتا ہے۔ جس طرح مظہر جانجاناں، حاتمؒ، قائم کے یہاں دکن کی "لچر" زبان کے خلاف سخت قسم کا ردِ عمل ملتا ہے۔ اسی طرح ناسخ نے تحریکِ اصلاح کا بیڑا اور اصل "دتی کے روڑوں" کے خلاف اُٹھایا تھا۔ خان آرزو نے میر عبد الواسع

لہ ان صفحات میں حاتم کی زبان کے حوالے انتخاب حاتم (از حسرت) یا قلمی نسخہ دیوان زادہ (لنٹن لائبریری) سے ہے ہر حوالہ کی تصدیق دیوان زادہ سے کر لی گئی ہے۔

ہانسوی (ہانسی علاقہ ہریانہ کا قصبہ ہے) کو فصیح نہ مان کر اپنی "تصحیح غرائب اللغات ہندی" میں برج بھاشا یا "زبان گوالیری" (کہ "افصح زبان ہائے ہند است") سے بارہا سند چاہی ہے۔ ناسخ اور اُن کے متبعین کو بھی دہلی کی ٹھیٹھ بولی کا ٹھاٹ پسند نہ تھا۔ اودھی زبان کے علاقے میں بیٹھ کر وہ اس کے محاورے سے پوری طرح لُطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لئے جس لفظ یا ترکیب کے وہ خود عادی نہ ہو سکے اُسے متروکات کی فہرست میں رکھ کر خارج کر دیا، قطع نظر اس کے کہ وہ دہلی اور اس کے نواح میں آج تک ویسے ہی رائج ہے۔

کھڑی بولی کے قدیم نمونے اور بھی زیادہ کمی کے ساتھ پائے جاتے ہیں۔ ہندی ادبیات میں کبیر داس، نانک اور نامدیو جیسے بھگت کویوں کے یہاں صرف اس کا پٹ مل جاتا ہے۔ شمالی ہند کی اُردو ادبیات میں بجز چند متفرق اشعار، صوفیاء کے ملفوظات اور افضل جھنجھانوی کے بارہ ماسہ کے اور کوئی مستند نمونہ فائز سے قبل کا نہیں ملتا جس کی روشنی میں لسانی نتائج اخذ کئے جا سکیں۔ اس لئے فی الحال لسانیاتی تجزیہ کے لئے افضل، حاتم اور قدماء کے کلام ہی کو پیشِ نظر رکھا جائے گا۔ ان کے علاوہ ادبی اُردو سے قطع نظر دوآبہ کے بالائی حصّہ کی مروّجہ زبان کے نمونوں سے بھی مدد لی جائے گی۔ میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور کی زبان پر خاص طور سے توجہ دی گئی ہے۔ اس لئے کہ بقول پروفیسر ژول بلوک "مغربی روہیلکھنڈ کے اضلاع کی اُردو نما زبان شاید بعد کے اثرات کی پیداوار ہے۔"[۱] بجنور، مراد آباد اور رامپور کی کھڑی معیاری اُردو سے قریب تر ہے صوتی نقطۂ نظر سے ان کے مقابلے میں میرٹھ، مظفر نگر، اور سہارن پور کے اضلاع کو "اضلاع مشدّدہ" کہا جاتا ہے۔

---

[۱] بلیٹن اسکول آف اورنیٹل اسٹڈیز (لندن) ۳۰-۱۹۲۸ء

اسمار :-

(۱) دکنی میں مذکر مؤنث دونوں کی جمع "ان" سے آتی ہے جیسے ہاتاں. جھاڑاں. عزیاں (س.ر) وغیرہ - یہ ادبی اردو کی قواعد کے خلاف ہے ۔ لیکن اس قسم کی جمع آج بھی میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع میں سننے میں آتی ہے[1]۔ قدیم اردو میں اس کی مثالیں حاتم تک کے یہاں (ع لب پر گلوں کے مُہر کرے ان لباں کا رنگ) مل جاتی ہیں۔ ہریانی کی یہ عام خصوصیت ہے جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔

(۲) "نے" کا استعمال دکنی کی طرح میرٹھ کی بولی میں بھی نہایت بے قاعدہ ہے یعنی فاعلی اور مفعولی دونوں حالتوں میں آتا ہے۔ مثلاً بندر نے اس نے دیکھ لیا (بندر نے اس کو دیکھ لیا)۔ فاعلی حالت میں "نے" محذوف بھی کر دیا جاتا ہے جس کی مثالیں دکنی میں بھی ملتی ہیں اور حاتم، سودا، اور میر کے یہاں بھی۔

ع گل کو محبوب میں قیاس کیا (میر)

"نے" کے باقاعدہ استعمال کی ایک مثال سودا کے یہاں بھی دیکھیے ؎

اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے یہ رو رو کے زار زار

اسمار ضمائر :-

(۱) دکنی کا یو (ق.ق ص ۳۱۲ س.ر ص ۶۴ ولی ص ۲) بعینہ آج بھی کھڑی بولی کے اضلاع میں سنائی دیتا ہے[2]۔ اے (ق.ق ص ۲۴) بھی "یے" کی شکل میں ملتا ہے۔

---

[1] لسانیاتی تبصرۂ ہند جلد نہم حصہ اوّل ص ۲۵۴ : گریرسن
[2] لسانیاتی تبصرۂ ہند جلد نہم حصہ اوّل ص ۲۵۴ : گریرسن

(۲) دکنی کا اُو (ق۔ق۔ صـ۳۱۲ اور صـ۵۴)۔ وو (س۔ رصـ۱۔ ولی صـ۱) جدید کھڑی بولی میں "اُ" اور "اُوہ" کی شکل میں پائے جاتے ہیں۔

(۳) دکنی میں عام طور سے اضافی حالت میں 'میرا' اور 'تیرا' کی بجائے 'مج' (ولی ۲ صـ۱) منج (ق۔ق صـ۴) اور 'تج' (ق۔ق صـ۳) استعمال ہوتا ہے۔ قدماء کے یہاں اس کی کثرت سے مثالیں مل جاتی ہے جس سے ثابت ہے کہ یہ دکنی سے مخصوص نہیں۔ مثلاً حاتم کے یہاں "تم ساتھ" (انتخاب صـ۱۸) تجھ گلبدن کی بو (انتخاب صـ۲۳) تجھ عشق (دیوان زادہ صـ۳۵۹) موجودہ اُردو اور دہلی کی بولیوں میں یہ اب متروک ہے۔

(۴) جمع متکلم اور حاضر کی مفعولی حالت میں "ہمنا" اور "ہمن کو" اور "تمنا" "تمن کو" کی شکلیں ملتی ہیں۔ حاتم کے یہاں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ نواحِ دہلی کی بولیوں میں صرف برج بھاشا میں یہ شکلیں پائی جاتی ہیں۔ حضرت کمال الدین مخدوم شیخ سعدی کارکوروی (سنہ ۱۵۶۳ء) نے ضمائر کی یہ شکلیں اپنے ایک شعر میں استعمال کی ہیں۔ ؎

ہمنا تمن کو دل دیا، تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا، تم وہ کیا، ایسی بھلی یہ پیت ہے

(۵) 'ہمن'۔ 'ہمیں' اور 'ہمیں کو' کی دکنی شکلیں بھی قدیم اُردو میں رائج تھیں۔ مثلاً پنڈت چندر بھان برہمن (سنہ ۱۶۶۲ء) کے اس مصرع میں۔ ع

خدا نے کس شہر اندر ہمیں کو لائے ڈالا ہے

افضل کا بھی ایک مصرع ہے۔ ع

تُئی دل سوں کبھی دیکھی ہمن کوں

لہ لسانیاتی تبصرۂ ہند جلد نہم حصہ اوّل صـ۲۵۴ (گریرسن)

لہ ولی کی زبان کے سارے حوالے کلیات ولی (جدید اڈیشن)، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی سے دیئے گئے ہیں۔

(۶) دکنی کے ضمائر میں سب سے قابل ذکر "آپس" ہے. جو قلی قطب شاہ (ص۴۰) سے لے کر ولی (کلیات ص۲) تک یکساں طور پر "خود" کے معنوں میں مستعمل پایا جاتا ہے. اس کا تعلق بھی نواح دہلی کی بولی سے ہے. افضل جھنجھانوی کے بارہ ماسہ کا یہ شعر دیکھئے ؎

اری سبز رنگ پیا کے باغ جا کر
آپس کوں بے دفا سہتی تو کا کر

افعال :-

دکنی کے بیشتر افعال کی توجیہ ہریانی کی قواعد سے کی جا چکی ہے. ہریانی سے پنجابی اور راجستھانی افعال کی کچھ مخصوص شکلوں کو نکال دینے کے بعد اس میں اور ہندوستانی کے افعال میں بالکل فرق نہیں رہتا. ادبی اردو میں افعال کی بیشتر وہ شکلیں (مثلاً جائے ہے. کمائے ہے. ماروں ہو. آدے، لادے، کیجیو. دیکھیو (غالب. مومن) موہے (انتخاب حاتم ص۸) ہووے گا (انتخاب حاتم ص۲۱) بناؤتا (بمعنی بناتا قلمی نسخہ دیوان زادہ ص۲۳۶) لے لیویں. دیویں) جو آج فصاحت کے مرتبہ سے گر گئی ہیں. نواح دہلی اور دہلی میں بلا تکلف استعمال کی جاتی ہیں. دکنی ادبیات میں یہ ہر صفحہ پر مل جائیں گی. کہلائے (س. ر ص۱۶) لیا نا (لانا ص۲۲ س. ر). جیوے گا (س. ر ص۳۷) سہارے (س. ر ص۳۷).

حروف :-

دکنی زبان کے تقریباً تمام حروف نواح دہلی کی بولیوں میں قدیم زمانے سے رائج ہیں. دکنی کے عام مستعمل حروف ربط حسب ذیل ہیں.

کا. کی. کے. کون (ق. ق ص۲۳۲) سیتی (ق. ق. ص۲۳۵) سیتے (ق. ق ص۸۸. تے (ق. ق ص۸۷ س. ر ص۱۸) سوں (ق. ق ص۲۳۲) تھے (ق. ق ص۲۳۲) ستیں (ق. ق ص۲۳۴)

ستی (ق۔ ق صـــ۲۳۶) میں (ولی صـــ۲) منے (ق۔ ق صـــ۲۲۵) میں (ق۔ ق صـــ۲۳۲)۔ لگوں (ق۔ ق صـــ۵) لگ (ولی صـــ۱۸)۔ لگن (س۔ رصـــ۱) میں (کلیات ولی صـــ۵) پہ (ق۔ ق صـــ۲۳۶) پو (س۔ رصـــ۱۵) تئیں۔

ان میں سے کوں۔ سوں۔ ستی سنے۔ لگ اور پہ دکنی میں عام مستعمل تھے۔ اور قلی قطب، وجہی اور ولی سب کے یہاں ملتے ہیں۔ "تھے" قلی قطب سے مخصوص ہے۔ لگن اور پو وجہی سے۔ شمالی ہند میں "ستی" (انتخاب صـــ۱ اور صـــ۲)، ستے۔ دیوان زادہ قلمی نسخہ صـــ۲۵۳

دل میں طمع نہیں مجھے شاہ وگدا ستے
میں سب کو چھوڑ ساز کیا ہوں خدا ستے

حاتم کے یہاں بھی بار بار آیا ہے۔ "لگ" سب قدما کے یہاں پایا جاتا ہے۔ کوں۔ میں میں انفی آواز آج تک نواحِ دہلی کی بولیوں کی خصوصیت ہے۔ قدیم اُردو میں کوں (صـــ۸۸ پنجاب میں اُردو) افضل جھنجھانوی کے بھی ملتا ہے۔ وہ "سے" کو "سیں" اور "نے" کو "نیں" بھی لکھتا ہے۔ پہ۔ کا۔ کی۔ کے۔ نے اور تئیں اُردو کے عام مستعمل حروف ربط ہیں۔

دکن کے دیگر عام مستعمل حروف حسبِ ذیل ہیں۔

سو۔ جو۔ تو۔ ہور۔ و۔ چ (ہی کے معنوں میں تاکید کے لئے)

ان میں "چ" تاکید کو چھوڑ کر (جیسے آپیچ۔ یونہیچ بمعنی آپ ہی، یوں ہی) باقی تمام حروف نواحِ دہلی میں قدیم زمانے سے اِنہیں معنوں میں رائج تھے "ہور"۔ "ہَور" "اَر" اور "ہر" کی شکل میں سہارن پور، میرٹھ، اور ضلع دہلی میں آج بھی سُنائی دیتا ہے۔

"چ" تاکید البتہ گجراتی یا مرہٹی زبان سے لی گئی ہے اس کی کوئی مثال شمالی ہند کی بولیوں میں نہیں ملتی۔ یہ گجراتی اور مرہٹی سے مخصوص ہے۔

قدیم دکنی کے اکثر غریب الفاظ کی توجیہ نواحِ دہلی کی بولیوں کے الفاظ اور محاورات سے کی جا سکتی ہے۔

(۱) دِھر یا دِھیر (فرہنگ قطب مشتری): بمعنی سمت اور طرف کے استعمال ہوا ہے۔ میرٹھ کے نواحِ کی بولی میں دھورے اب تک سِمت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ (دیکھئے میرٹھ کی زبان کا نمونہ: گریرسن: جلد نہم)۔

(۲) کدھیں (ف۔ق۔م) کبھی کے معنوں میں اَب تک دہلی اور اس کے اطراف میں مستعمل ہے۔

(۳) اتاول (ف۔ق۔م) قدیم دکنی میں "جلد" کے معنوں میں آتا ہے۔ دہلی کا محاورہ ہے۔

اتاوَلا، باؤلا (جلد باز یا پاگل ہونا ہے)۔

(۴) اپی (ف۔ق۔م) آپ ہی کے معنوں میں پانی پت اور کرنال میں سُنائی دیتا ہے۔

(۵) اِتّا۔ جتّا (ف۔ق۔م) جہلا میں عام مستعمل ہے۔

(۶) فکروند (ف۔ق۔م) فکرمند: ہریانی میں عام طور سے (م)، (و) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ جیسے دہلی میں چلمن کو چلون عام طور سے کہتے ہیں۔

(۷) وستاد۔ وصول (ف۔ق۔م) بمعنی اُستاد اور اُصول، قدیم دکنی میں ملتے ہیں۔ دہلی اور میرٹھ کی بولی میں یہ عام محاورہ ہے۔ جہاں اُستاد کو 'وستاد' اور 'اُن' کو 'وِن' بولا جاتا ہے۔

(۸) اچھنا (سب رس) بمعنی 'ہونا' عام طور سے دکنی میں ملتا ہے۔ دہلی کے

مضافات کی جو قدیم بولی دکن لے جائی گئی ہے اس میں فعل ' اچھنا " ہے اور اہے کے ساتھ ساتھ مستعمل تھا فعل ' اچھنا ' قدیم وجدید راجستھانی اور گجراتی میں ملتا ہے اور یہ اپ بھرنش کا عام مستعمل فعل تھا۔ جو اکثر بولیوں میں اب متروک ہو گیا ہے۔

(۹) دیسنا: بمعنی دکھائی دینا دکنی کا عام مستعمل فعل ہے۔ شمالی ہند کی قدیم اُردو میں بھی یہ بہ کثرت ملتا ہے۔

(۱۰) اُپجنا: بمعنی اُگنا۔ پیدا ہونا۔ خالص سنسکرت کا لفظ ہے۔ جو دکنی میں ملتا ہے۔ لیکن اُردو میں عرصہ سے متروک ہے دہلی کا ایک محاورہ ہے: بویا گیہوں اُپجا جو (بھلائی کے بدلے بُرائی)۔

(۱۱) پتیانا: یقین کرنے کے معنوں میں قدیم دکنی میں ملتا ہے۔ اُردو میں اب متروک ہے۔ لیکن دہلی کے دو محاورے سُنیئے۔

(۱) اندھا جب پتیائے (یقین کرے) جب دو آنکھیں پائے۔

(۲) بامن جبھی ہی پتیائیں (جب مطلب ہو جائے تو یقین کرنا)۔

(۱۲) سیونا: بمعنی پرورش کرنا۔ خدمت کرنا۔ قدیم دکنی میں مستعمل ہے۔ دہلی کا محاورہ۔

انڈے سیوے فاختہ کوے میوے کھائیں

(۱۳) گھالنا: قدیم دکنی کا عام مستعمل فعل ہے۔ اس کی شکل دہلی کے ایک محاورہ میں دیکھئے۔

ایک تو گھر گھالو آپنا دوسرے پاس پڑوس (دوسروں کو ساتھ لے ڈوبنے کے معنوں میں)۔

(۱۴) رُچ : خوشی کے معنوں میں سب رس اور قطب مشتری میں اکثر ملتا ہے۔ دہلی کا ایک محاورہ ہے۔

ایک گھر بچے تو سب گھر رُچے (خاندان میں ایک کا خوش ہونا سب کا ہونا ہے)

(۱۵) ناؤں اور ٹھاؤں (نام اور جگہ) : قدیم دکنی اور اُردو میں عام مستعمل تھے دہلی کے دو محاوروں میں یہ جوں کے توں ملتے ہیں۔

(۱) پھٹے میں پاؤں، دفتر میں ناؤں (دخل در معقولات دنیا)

(۲) ثابت قدم کو ہر جگہ ٹھاؤں (جگہ)

(۱۶) فارسی افعال پہ اُردو کا ٹھپّہ لگا دینے کا رجحان دکنی میں عام ہے۔ مثلاً خرچ سے خرچنا۔ شمالی ہند میں اب یہ کم بولا جاتا ہے۔ دہلی کا پُرانا محاورہ ہے۔

جو گدھا جیتیں سنگرام تو کاہے کو خرچے دام

(ادنیٰ سے نکلے کام تو اعلیٰ کو کون پوچھے)

(۱۷) کہوانا۔ کاڑنا (نکالنا) آج بھی دہلی اور اس کے مضافات میں رائج ہے۔ ے میں کمینہ ترا کہایا ہوں (حاتم)

ہمارے خیال میں مرہٹی اور گجراتی زبان کے بعض لسانی اثرات کو چھوڑ کر دکنی کے تمام غریب الفاظ کی توجیہ نواح دہلی کی تین بولیوں (ہریانی۔ کھڑی اور برج) سے کی جا سکتی ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے شمالی ہند میں زبان کے ارتقا کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس کے برخلاف دکن میں اجنبی بولیوں کے ماحول میں یہ لسانی ارتقا بالکل رُک سا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دکنی زبان میں الفاظ کی وہی شکلیں ملتی ہیں جو شمالی ہند میں آج سے نو سو برس پہلے رائج تھیں۔

جدید آریائی زبانوں کی تحقیق کے سلسلے میں محققین کی ایک عام غلطی یہ بھی رہی ہے کہ اُنھوں نے بعض بولیوں کو بعض علاقوں سے مخصوص کر دیا ہے۔ اس قسم کے لسانی مغالطوں کا پول ہم شروع سے کھولتے آئے ہیں۔ جیسا کہ نئی تحقیق سے اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی ہے کہ مہاراشٹری پراکرت کا مہاراشٹر دیس سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ وہ شورسینی کی ایک نئی ترقی یافتہ شکل تھی۔ دراصل ہندوستان میں زبانیں قبیلوں، سماج کے مختلف طبقوں اور پیشہ وروں کی جماعتوں سے مخصوص رہی ہیں۔ ہر زمانہ میں دہلوی سماج کے مختلف طبقات میں مختلف بولیاں رائج رہی ہیں[1]۔ ہمارا پہلا ماہرِ لسانیات اور لغت نگار خان آرزو جب زبان اہلِ اُردو کا معیار متعین کرتا ہے۔ تو اُسے حسب ذیل زبانوں کے گورکھندے پر نظر رکھنی پڑتی ہے: "ہندی کتابی (سنسکرت)، گوالیاری (برج)۔ ہندی راجپوتی (راجستھانی)، ہندی کشمیری (کشمیری)، ہندی پنجاب (پنجابی)، زبان مردم پنجاب، زبان اُردو۔ زبانِ اکبر آباد (آگرہ) شاہ جہاں آباد (دہلی) اصطلاح شاہجہاں آباد و اہلِ اُردو۔ ہندی فصحاء۔ چنانچہ معیاری اُردو کی تشکیل میں ان سب نے مختلف زبانوں میں ہاتھ بٹایا ہے۔

تاریخی تحقیق سے جوں جوں مختلف علاقہ کی آبادیوں کی نقل و حرکت پر روشنی پڑے گی۔ لسانی گتھیاں خود بخود حل ہوتی جائیں گی۔ جس طرح آج دوآبہ کے مختلف راجپوت گھرانوں میں راجستھانی گیت رائج ہیں۔ ممکن ہے کہ دکن میں بھی شمالی ہند کی ایک بولی نہ گئی بلکہ کئی بولیاں پہونچی ہوں۔ جن کی آمیزش سے بعد کو وجہی اور قلی قطب شاہ کی

---

[1] ہمارے صوفیا ملتانی بھی بولتے تھے۔ پنجابی بھی ہریانی، ہندوستانی اور برج بھاشا بھی۔ (دیکھئے اُردو کی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام: ڈاکٹر عبدالحق)۔

معیاری دکنی شکل ہوتی ہے۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ تمام بولیاں نواح دہلی ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لیے اُردو کی ابتدا اور ارتقا پر مزید کام کرنے کے لیے نواح دہلی ہی کی بولیوں کی جدید و قدیم شکلوں پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں یہ سنگِ گِراں حائل ہے کہ دہلی کے نواح کی بولیوں (ہریانی اور کھڑی اور میواتی) کے قدیم نمونے ناپید ہیں۔ اور شاید اسی بناء پر محمود شیرانی اور ڈاکٹر محی الدین قادری زور[1] کھڑی بولی اور ہریانی کو فتح دہلی کے بعد کا ارتقا مانتے ہیں اور اس طرح چندر شرما گلیری کے اس قیاس کی تائید کرتے ہیں کہ "بدیسی مسلمانوں نے آگرہ، دہلی، سہارن پور، میرٹھ کی 'پڑی' بولی کو "کھڑی" بنا کر اپنے لشکر اور سماج کے مطابق بنا لیا"۔[2]

---

[1] "اُردو اور پنجابی" : نقوش ؛ جولائی ۱۹۵۲ء ، ۶

[2] ناگری پرچارنی پترنما ؛ سمبت ۱۹۷۸ء ، ص ۱۴۳

کتابیات

اردو کتب

(۱) دیوان زادہ (قلمی) : شاہ حاتم ڈلٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(۲) تصحیح غرائب اللغات ہندی : خان آرزو (ایضاً)

(۳) سیر الاولیاء : ملفوظات شیخ حمید الدین ناگوری (۱۱۹۳ء تا ۱۲۷۴ء)، نقل قلمی نسخہ مملوکہ خلیق احمد نظامی صاحب شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)۔

(۴) سرور الصدور (قلمی نسخہ) : (ایضاً)

(۵) خیر المجالس : حضرت روشن چراغ دہلوی (نقل قلمی نسخہ مملوکہ پروفیسر محمد حبیب مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ)۔

(۶) پنجاب میں اردو : مرتبہ محمود شیرانی

(۷) خالق باری : مرتبہ ؍

(۸) پرتھی راج راسا : مرتبہ ؍

(۹) اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام : عبد الحق

(۱۰) سب رس : مرتبہ عبد الحق

(۱۱) قطب مشتری " "

(۱۲) نصرتی : تصنیف عبدالحق

(۱۳) قواعد اُردو : ؍؍ عبدالحق (نیا اڈیشن)

(۱۴) ہندوستانی لسانیات : ؍؍ محی الدین قادری زور

(۱۵) کلیات محمد قلی قطب شاہ : ؍؍ ؍؍ ؍؍

(۱۶) اُردو شہ پارے : ؍؍ ؍؍ ؍؍

(۱۷) نقوش سلیمانی : ؍؍ سید سلیمان ندوی

(۱۸) عرب و ہند کے تعلقات : ؍؍ ؍؍

(۱۹) دریائے لطافت : ؍؍ انشاء اللہ خاں

(۲۰) مقدمہ آب حیات : ؍؍ محمد حسین آزاد

(۲۱) داستان تاریخ اُردو : ؍؍ حامد حسن قادری

(۲۲) کیفیہ : ؍؍ پنڈت دتاتریہ کیفی

(۲۳) گرو گرنتھ آو (اُردو) : ؍؍ نول کشور پریس

(۲۴) چندو کی پہیلیاں : ؍؍ محمد نعیم الرحمٰن

(۲۵) جواہر خسروی : ؍؍ انسٹی ٹیوٹ پریس۔ علی گڑھ

(۲۶) دکن میں اُردو (چوتھا ایڈیشن) : ؍؍ نصیر الدین ہاشمی

(۲۷) یورپ میں دکنی مخطوطات : ؍؍ ؍؍

(۲۸) کلیات ولی (نیا ایڈیشن) : ؍؍ نورالحسن ہاشمی

(۲۹) اُردوئے قدیم : ؍؍ شمس اللہ قادری

(۳۰) امیر خسرو : ؍؍ محمد وحید مرزا

(۳۱) ہندوستانی لسانیات : جان بیمس (مترجمہ احتشام حسین)

(۳۲) فارسی پر اُردو کا اثر : غلام مصطفیٰ

(۳۳) رسالہ "ہندوستانی" الہ آباد: ۳۴ء، ۳۵ء، ۳۷ء، ۳۸ء

(۳۴) رسالہ "اُردو" (انجمن ترقی اردو): ۳۰ء، ۳۱ء، ۳۴ء، ۳۵ء، ۳۷ء، ۳۸ء، ۴۰ء۔

(۳۵) اورنیٹل کالج میگزین (لاہور): مئی ۲۶ء، نومبر ۲۶ء، نومبر ۲۸ء، مئی ۲۹ء، فروری ۳۱ء، مئی ۳۱ء، اگست ۳۱ء، مئی ۳۴ء، اگست ۳۵ء، نومبر ۳۵ء، فروری ۳۷ء، اگست ۳۷ء، نومبر ۳۷ء، فروری ۳۸ء

ہندی کتب

(۱) ہندی بھاشا کا اتی ہاس : دھیریندر ورما

(۲) برج بھاشا دیاکرن : "

(۳) گرامین ہندی : "

(۴) ہندی بھاشا اور ساہتیہ : شیام سندر داس

(۵) بھاشا وگیان : "

(۶) ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس : رام چندر شکل

(۷) ہندوستانی کا ادگم : "

(۸) ہندی اُردو اور ہندُستانی : پدم سنگھ شرما

(۹) تلناتمک بھاشا وگیان : منگل دیو شاستری

(۱۰) پنجابی اور ہندی کا سامانیہ بھاشا وگیان : دونی چند

(۱۱) ہندی سروے کمیٹی رپورٹ :

(۱۲) سامانیہ بھاشا وگیان : بابورام سکسینہ

(۱۳) سنت کبیر : ڈاکٹر رام کمار ورما

(۱۴) مشر بندھو ونود (حصہ اوّل) : مشر بندھو

(۱۵) ہندی ساہتیہ کا اتی ہاس : "

(۱۶) ہندی بھاشا اور اُس کے ایتہاس کا وکاس : پنڈت ایودھیا سنگھ (ہری اودھ)

(۱۷) ہندی پر فارسی کا پربھاؤ : واجپئی

(۱۸) برج بھاشا ویاکرن : "

(۱۹) مادھیانک ویاکرن (مرہٹی گرامر) : شیو نرائن گوکلے

(۲۰) پرتھوی راج راسو : ناگری پرچارنی سبھا

(۲۱) دکھنی کا پد اور گد : شری رام شرما

(۲۲) پترکا۔ ناگری پرچارنی سبھا : سمبت ۱۹۷۸، ۹۰، ۹۴، ۹۵

انگریزی کتب

(۱)	لنگوئیسٹک سروے آف انڈیا جلد اوّل اور نہم (حصہ اوّل) :	سر جارج گریرسن
(۲)	اوری جن اینڈ ڈیولپمنٹ آف بنگالی لنگویج (جلد اوّل) :	ڈاکٹر سنیتی کمار چٹرجی (کلکتہ)
(۳)	انڈو ایرین اینڈ ہندی (گجرات ورناکیولر سوسائٹی۔ احمد آباد) :	ایضاً
(۴)	انٹروڈکشن ٹو کمپریٹو فائی لالوجی :	پی۔ ڈی۔ گے (پونا)
(۵)	ہندوستانی فونٹیکس :	ڈاکٹر محی الدین قادری زور
(۶)	فائی لولوجی کل لیکچرز :	آر۔ جی۔ بھنڈارکر
(۷)	ایولوشن آف اودھی :	ڈاکٹر آر۔ بی۔ سکسینہ
(۸)	فونولوجی آف پنجابی :	بی۔ ڈی۔ جین
(۹)	پنجابی مینول اینڈ گرامر :	گریہم۔ بیلی
(۱۰)	اے۔ گرامر آف ہندی لینگویج :	کیلاگ
(۱۱)	نیپالی ڈکشنری :	آر۔ ال۔ ٹرنر
(۱۲)	تحفتہ الہند (برج بھاشا کی پہلی قواعد مصنفہ مرزا خان)	ایم۔ ضیاء الدین (شانتی نکیتن)

(۱۳) شاہ برکت اللہ کنٹری بیوشن اِن ہندی لٹریچر	:	ڈاکٹر لچھمی دھر شاستری ۱۹۴۹ء (دہلی)
(۱۴) ہسٹری آف پرشین لینگویج اینڈ لٹریچر ایٹ دی مغل کورٹ (جلد اول)	:	عبدالغنی
(۱۵) کمپریٹیو گرامر آف دی ماڈرن ایرین لینگویجز آف انڈیا	:	جان بیمس
(۱۶) بلیٹن آف دی اسکول آف اورینٹیل اسٹڈیز (لندن)	:	جلد (۱۹۲۸-۳۰) - (۱۹۳۶) - (۱۹۳۸) (۱۹۳۹)
(۱۷) جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی	:	(۱۹۱۰) - (۱۹۲۳) - (۱۹۴۹) -

مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی

This book is fit for
M.A. Final (2nd paper)
Linguistics & General
knowledge.

This book is for II